طنزیاتِ آزاد

حدیث الغاشیہ

مولانا ابوالکلام آزاد کے طنزیہ مضامین،
انتخاب الہلال والبلاغ

اعتقاد پبلشنگ ہاؤس
۱۴۹۱، کوتانہ اسٹریٹ، سوئی والان، نئی دہلی ۲ ۱۱۰۰۰

طنزیات آزاد

حدیث الغاشیہ

بار اول	فروری ۱۹۸۷ء
نام کتاب	طنزیاتِ آزاد
مؤلف	مولانا ابوالکلام آزاد
ناشر	اعتقاد حسین صدیقی
مطبع	
قیمت	۱۵ پندرہ روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابتدائیہ

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے ۱۹۱۵ئہ میں البلاغ کے دور میں فرمایا تھا کہ

"اگر پیام اجل سر پہ آپہنچا تو آہ کس سے کہئے اور کون جانتا ہے کہ اِس مشتِ خاک کے ساتھ کیا کیا چیزیں ہیں جو سپردِ خاک ہوں گی اور فیضانِ الٰہی نے اپنے فضلِ مخصوص سے کیسے کیسے دروازے علوم و معارف کے اسی عاجز پر کھولے ہیں جو بغیر اس کے کہ ایک طالب صادق و صالح بھی اُن سے گذرے بند کے بند رہ جائیں"۔

حضرت مولانا مرحوم کی وفات کی وجہ سے دنیائے اسلام نے نہ صرف ایک مفسر قرآن اور جامع کمالات شخصیت کھو دی ہے بلکہ اُردو ادب ایک بڑے مفکر و صاحب فن طنز و مزاح نگار سے محروم ہو گیا ہے۔

تو بخویشتن چہ کردی کہ بما کنی نظیری
بخدا کہ واجب آمد ز تو احتراز کردن

(نظیری)

یہ قلعہ بنا ڈالیں گے۔ لیکن جب یہ قلعہ بن جائے تو ان کو خوداً
باہر کرو کیونکہ وہ پھر اسی قلعہ کو ڈھا دیں گے۔"

مندرجہ بالا رائے کی تصدیق حضرت مولانا مرحوم کے ان طنزیہ مضامین سے ہوتی ہے جو بیشتر انھوں نے دور الہلال والبلاغ میں سپردِ قلم کیے اور ہم ان بکھرے ہوئے بیش بہا مضامین کو کتابی صورت میں پیش کرنے کا فخر حاصل کر رہے ہیں۔

اس مجموعے کا نام حدیث الغاشیہ ہم الہلال سے مستعار لے رہے ہیں جس عنوان کے تحت اس قسم کے مضامین الہلال کے دور میں پہلے پہل حضرت مولانا کے معجز نگار قلم سے شائع ہوئے۔

اس مجموعے کا مقصد وحید یہ ہے کہ مولانا مرحوم کے جواہر پاروں کو جو ایک زمانہ سے مولانا کے شیدائیوں کی نظروں سے اوجھل تھے۔ یکجا کر کے محفوظ کیا جائے۔ کیونکہ مولانا مرحوم کی موت کی وجہ سے علوم و معارف کے جو دروازے حضرت مولانا کی ذات سے وابستہ تھے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گئے ہیں۔

امید ہے اردو ادب کے پرستار ہماری اس حقیر کوشش کو بہ نظرِ

جناب غلام احمد فرقت کاکوروی رقم طراز ہیں کہ

"بہت سے لوگ جو بظاہر بے حد سنجیدہ، مذہبی، خاموش اور اپنے آپ کو بہت ہی لیے دیئے نظر آتے ہیں۔ ان میں بعض بعض اپنی نجی زندگی میں بے حد شوخ اور بذلہ سنج ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی خلوت و جلوت میں بڑا بُعد ہوتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا شمار بھی انہیں بزرگوں میں سے تھا۔ جو بظاہر خاموش اور بہ باطن ایک باغ و بہار قسم کے انسان تھے۔ چنانچہ جن لوگوں سے مولانا کی بے تکلفی تھی ان کا کہنا ہے کہ وہ اپنی نجی زندگی میں نہ صرف بے حد شوخ، ہنس مکھ اور بذلہ سنج ہی تھے بلکہ ضلع جگت اور رعایت لفظی یا فقرے چست کرنے میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ ان کی فقرے بازی کا اندازہ ان کی مندرجہ ذیل رائے سے ہوتا ہے جو انھوں نے ایک مرتبہ مولانا ظفر علی خاں اور مولانا شوکت علی مرحوم کے بارے میں قائم کی تھی۔

"ملک میں کسی تحریک کو مہینوں کی بجائے ہفتوں میں چلانا ہو تو مولانا ظفر علی خاں اور شوکت علی کو چھوڑ دو۔ وہ بہ سرعت

فہرست

استحسان دیکھیں گے۔ نظیری کی زبان میں ہم آخر میں حضرت مولانا مرحوم کی یاد پھر تازہ کرتے ہیں۔

جو ہر بفیض من ورنہ زنگار بماند
آنکہ آئینہ من ساخت نہ پرداخت دریغ
تو نظیری! زفلک آمدہ بودی چو مسیح
باز پس رفتی و کس قدر تو نہ شناخت دریغ

نذیر احمد

مسلم لیگ (اجلاس ۱۹۱۶ء)

(البلاغ ۴ر فروری ۱۹۱۶ء)

مسلم لیگ کے گذشتہ اجلاس کا تذکرہ اخبارات و رسائل کے صفحات اور بحث و مذاکرہ کی صحبتوں میں قریب الاختتام ہے کامل چار ہفتے اوپر گذر چکے اور ہر شاہد و سامع نے اس کے نقد و بحث میں کچھ نہ کچھ حصہ لیا۔ تاہم بہت سی ضروری باتیں اب تک باقی ہیں اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ اصلیت کو مشتبہ کرنے کے لیے چند مفسدانہ غلط فہمیاں پھیلائی جا رہی ہیں جنوری کے اوائل میں اگر ہمیں فرصت ملتی تو بہ تفصیل اس واقعہ کی نسبت لکھتے لیکن اب تفصیل کا موقعہ نہیں رہا۔ صرف اُن غلط فہمیوں کی طرف اشارہ کر دینا چاہتے ہیں جن کا اثر واقعہ کی عارضی حیثیت کی جگہ اصول نتائج و عبر پر ہو سکتا ہے

اس سلسلے میں سب سے پہلی چیز جو سامنے آتی ہے وہ مسلمانان بمبئی کے اندرونی اختلافات کا مسئلہ ہے جس کو عام طور پر لیگ کے ہنگامہ کی اصل

لیگ کے اجلاس سے پہلے جو کچھ ہوا، اور لیگ کے اجلاس کے اندر جو کچھ ہوا، دونوں کی پوری سرگزشت دنیا کے سامنے موجود ہے۔ اور وہ اس حقیقت کو اس درجہ روشن اور واضح صورت میں نمایاں کر رہی ہے۔ کہ ہندوستان کے مخفی دسائس و فریب کی پوری تاریخ میں ایسا بے نقاب جلوہ کبھی بھی نظر نہیں آیا تھا۔

ان نادانوں یا دانستہ حق پوشوں کا بیان ہے کہ لیگ نے اس سال کانگرس سے ملنا چاہا۔ اور ہندوستان کے مستقبل کی امیدوں میں دو یک قلم ہندوؤں کے ہاروش کھڑی ہوگئی مثل اور مقامات کے بمبئی میں بھی مسلمانوں کا ایک گروہ اس بدعت کا مخالف موجود تھا۔ اس نے پہلے کوشش کی جلسہ نہ ہو۔ پھر جب سید علی امام نے بمبئی میں راضی نامہ کرانے کی یادگار عزت حاصل کی تو مجبوراً ساتھ ہو گیا تاہم اختلاف شدید تھا۔ اس کی دانشمندی و سیاست فہمی کس طرح بھی گوارہ نہیں کر سکتی تھی کہ مسلمان ہندوؤں کے ساتھ مل کر اپنے آپ کو تباہ کر ڈالیں۔ پس وہ ایک مجاہد حق جماعت کی طرح جہاد فی سبیل الحق کے لیے تیار ہو گیا، اور شہر کے بدمعاشوں اور رذیلوں کی ایک پلٹن طیار کر کے لیگ پر حملہ کر دیا۔

علت قرار دیا جاتا ہے

ہم اس تعجب اور حیرانی کے ظاہر کرنے کے لیے الفاظ نہیں پاتے جن کے ساتھ ہم نے ان تحریروں کو پڑھا ہے جو بعض مدعیانِ علم و واقفیت نے شائع کی ہیں۔ اور جن کے اندر وہ یقین کے ساتھ ظاہر کرتے ہیں کہ مسلمانانِ بمبئی کے سیاسی اختلاف اور پارٹی فیلنگ نے لیگ کے جلسے کو اس مصیبت سے دوچار کیا!

دنیا میں علم و یقین کے حاصل کرنے کا ذریعہ مشاہدہ ہے سماع ہے روایت ہے، قیاس صحیح ہے اور تواتر و تسلسل واقعات ہے ہم حیران ہیں کہ لیگ کے اجلاس بمبئی کے متعلق یہ تمام ذرائع موجود ہیں اور ان میں سے ہر ذریعہ صاف صاف یقین دلا رہا ہے کہ اس ہنگامہ کو نہ تو مسلمانان بمبئی کے کسی سیاسی اختلاف آراء سے تعلق تھا اور نہ مختلف سیاسی جماعتوں کی کشمکش سے۔ یہ جو کچھ ہوا اس کی علت اصل صرف ایک ہی تھی، اور وہ صرف اس مخفی طاقت کی کارفرمائی تھی جو ہمیشہ خود تو پسِ پردہ رہتی ہے لیکن اپنے تنخواہ دار سپاہیوں کو آگے بھیج دیتی ہے تاکہ میدان رزم میں خیمہ نشین سپہ سالار کے احکام کی تعمیل کریں۔

لطف یہ ہے کہ ان بحث کرنے والوں میں اکثر لوگ وہ ہیں جو خود بمبئی میں موجود تھے، لیکن ان کی واقفیت کا یہ حال ہے کہ بیچارے علی خاں منیمی کو "مولانا عبدالرؤف" کے لقب سے لکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ کوئی بمبئی کا بڑا لیڈر ہے جس نے بھرے جلسے میں مخالفت کی اور محض سیاسی اختلاف کی وجہ سے شور و غل مچایا۔ حالانکہ بمبئی کا ہر شخص اس شخص کے حالات سے واقف ہے اور ہر جگہ اس قسم کے باجے بازاروں میں بکثرت ملتے ہیں جن کو کوک دیا جائے تو بجتے رہیں گے۔

بہر حال بمبئی میں لیگ کے موقع پر جو کچھ ہوا اس کو کسی سیاسی اختلاف و جماعت بندی سے کوئی تعلق نہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ہندوستان کا اتحاد ان لوگوں کی نظروں میں کس درجہ مہیب چیز ہے۔ جنہوں نے اپنی کامیابیوں کا محل تفریق عناصر کی بنیاد پر تعمیر کیا ہے علی الخصوص موجودہ حالات میں کانگرس اور لیگ کا یکجا ہونا اور مل جل کر ایک کمیٹی بنانا ان کے مقاصد کے لیے کس درجہ ہولناک ہے؟ بمبئی میں انہی مقاصد سے لیگ کو منعقد کیا جاتا تھا۔ پس کوشش کی گئی کہ اس کی راہ میں موانع پیدا کیے جائیں اس لئے ہمیشہ سے ایک ہی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے اور وہ ہم سب کو

لیکن جن لوگوں کو اخبارات کے صفحوں پر اس طرح علانیہ کذب بیانی سے عار نہیں آتا، کیا وہ بتلا سکتے ہیں کہ جس جماعت نے لیگ کی مخالفت میں حصہ لیا، اُن میں وہ کون لوگ ہیں جن کو سیاست فہمی اور قوم پرستی کا یہ خلعت عطا ہو رہا ہے؟ کیا پچاس ساٹھ آدمیوں کی وہ جماعت جو وزیروں کے حلقہ میں آکر بیٹھ گئی تھی اور جسے صرف یہ تعلیم دی گئی تھی کہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد شیم شیم کا نعرہ بلند کرتے رہنا، چنانچہ وہ مسکین اپنے پیشواؤں کے شور و غل پر بھی اس آموختہ کو دہرا دیتے تھے؟ اگر وہ نہیں تو پھر کیا علی خاں معروف بہ عبدالرؤف جو پرانی گاڑیوں کو رنگا کرتا ہے اور جس غریب کو یہ بھی معلوم نہیں کہ کانگریس کیا بلا ہے اور لیگ کس جانور کا نام ہے؟ اگر وہ بھی نہیں تو پھر کیا بمبئی کے بدمعاشوں کا وہ سردار جو اسٹیج کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا تھا اور جو لیگ سے اپنے سیاسی اختلاف کو اس ماہرانہ جملے میں ادا کرتا تھا کہ "میرا ملک کابل کیوں ہندوؤں کو بخش رہے ہو"؟ اگر یہ لوگ صرف مزدور تھے اور سیاست کا معلم وہی تھا جس کے ذریعے انھوں نے مزدوری پائی تو پھر کیا سلیمان قاسم کے دوپلوں کی تھیلیوں میں اس سیاسی حزم و تدبر کو ڈھونڈیں حالانکہ روپیہ سے آلو اور بمبئی کے بدمعاش دونوں چیزیں خریدی جا سکتی ہیں مگر نہ تو عقل خریدی جا سکتی ہے اور نہ علم!

مرکب بنا کر اس کے سپرد کر دیا۔ پھر کس قدر نادان ہیں وہ لوگ جو سواری کے ایک چار پائے کی تو شکایت کرتے ہیں مگر اس کو نہیں دیکھتے جس کے ہاتھ میں اس کی لگام تھی اور جس کے بوجھ نے اس مسکین پر قابو پا یا تھا۔

قرآن حکیم نے ہم کو شیطان کا ایک پورا خاصہ یہ بھی بتلایا ہے کہ وہ اپنے وفادار غلاموں کو ایک کام کا حکم دیتا ہے لیکن جب بھی وہ اس کی تعمیل کرتے ہیں تو دنیا سے کہتا ہے کہ مجھے اس کام سے کیا واسطہ؟

کمثل الشیطان اذ قال للانسان اکفر. فلما کفر قال انی بریٔ منک (۵۹-۱٦)

اُن کی مثال شیطان کی سی ہے۔ اس نے انسان کو کہا کہ کفر و ضلالت اختیار کر۔ تب انسان نے اس حکم کی تعمیل کی تو پھر وہ الگ ہو گیا اور کہنے لگا کہ مجھے اس کام سے کوئی واسطہ نہیں۔

پس یہ بے فائدہ ہے کہ آج بھی وہ ظاہر کرے کہ مجھے اس شرارت سے کوئی واسطہ نہیں اور میں اس سے بری الذمہ ہوں کیونکہ ہمیں اس کی قدیمی عادت معلوم ہے۔ اور اگرچہ ہمیشہ سب کچھ وہی کرتا ہے لیکن ہمیشہ اپنے کو الگ دکھلاتا اور ظاہر کرتا ہے کہ اسے کوئی سروکار نہیں۔

معلوم ہے شیطان کو کبھی بھی انسان نے اپنے سامنے نہیں دیکھا ہے۔ اس کی وسوسہ اندازیوں نے ہمیشہ انسانوں ہی کو اپنی سواری کا گدھا بنایا ہے۔ اَلَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ مِنَ الْجِنَّۃِ وَالنَّاسِ۔

پس شیطان اس موقعہ پر بھی اپنے ابلیسانہ تخت فساد کے ساتھ اُترا اور اس نے اپنے فرماں بردار اور اطاعت شعار فرزندوں کو پکارا کیا جب اُس کی نگاہ لطف کی ایک پراسرار گردش ثابت قدمی کی بڑی بڑی چٹانوں کو پانی کی طرح بہا دے سکتی ہے تو پھر یہ تو اس کے سعادت مند فرزندوں کا گھرانا اور اُس کے عشاق قدیم کی ایمان کیف محفل تھی یہاں تو گفت و شنود حسن و عشق اور قول و قرار، وصل و وصول کی جگہ صرف ایک تبسم امید نوازہی دیوانہ بنا دینے کے لیے کافی تھا۔

شنیدہ ام کہ سگاں را قلادہ می بندی
چرا بگردنِ حافظ نمی نہی رسنے؟

پس یہ اطاعت شعاران عشق اپنے پُراسرار و غیر مرئی معشوق کے حکموں کے آگے سچے عاشقوں کی طرح گر گئے اور اپنے وجود کو ایک نذرانہ بنا

تھا اور وہ حاصل ہو سکا یا نہیں۔

یہ بالکل ظاہر ہے کہ اس بسال لیگ کے بمبئی میں منعقد کرنے کا کوئی مقصد اس کے سوا نہ تھا کہ ہندو مسلمانوں کے مکمل اتفاق کی طرف سعی و طلب کا ایک نمایاں قدم بڑھایا جائے۔ اور موجودہ حالات و مقتضیات کے مطابق مسلمانوں کی طرف سے ایک زندہ سیاسی آواز بلند ہو سکے۔

یہی مقصد تھا جس کے لیے ایک جماعت اس بات پر اڑ گئی کہ لیگ کا اجلاس ضرور بمبئی میں منعقد کیا جائے اور اس کے فوائد کے یقین کا اس قدر اس پر استغراق طاری ہوا کہ انعقاد کی خوشی میں باہمی راضی نامہ کی ایک بدترین اور قابل صد نفرت شکل بھی اس نے منظور کر لی۔

یہ راضی نامہ وہ ہے جس کو سر سید علی امام کی اسی "صلح فرما" خصوصیت کا دوسرا عمل سمجھنا چاہیئے جس کا پہلا عمل مسئلہ مسجد کانپور کی مشہور "صلح" ہے

اسی راضی نامہ کا مقصد یہ تھا کہ لیگ کے اجلاس میں سوا ئے تین تجویزوں کے جن کے الفاظ تک قرار پا چکے تھے اور کوئی کارروائی نہ کی جائے۔

وفاداری۔ توسیع عہد وائسرائے، اور ایک کمیٹی کا انعقاد۔

یاد رکھو کہ شر و فساد جس قدر ہے شیطان ہی کی وسوسہ اندازی کا نتیجہ ہے ورنہ اسلام کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا فرزند بھی راہ فساد اختیار نہ کرتا ان الشیطان للانسان عدو مبین - اسی وسوسہ اندازی کا نتیجہ تھا کہ لیگ سے پہلے کبھی شر و فساد پیدا ہوا اور اجلاس کے اندر بھی لیس ہمارا جو کچھ بھی معاملہ ہے وہ جہل و نادانی کی اُن پتلیوں سے نہیں ہے جو دنیا کے سامنے ناچ رہی تھیں بلکہ جو کچھ بھی ہے وہ اس خوفناک آسیب سے ہے جس کی روح اُن کے اندر حلول کر گئی ہے - اور جب وہ چیخ رہے تھے تو اس کی آواز ان کے حلقوم سے نکل رہی تھی !

اس سے بڑھ کر قابلِ تذکرہ شرارت اُن لوگوں کی ہے جو لیگ کے گزشتہ اجلاس کے اثرات و نتائج کی نسبت طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلاتے ہیں اور اس ہنگامہ کے واقعات کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں گویا فضول نے لیگ کے اجلاس کو کھو دیا -

لیکن ہم کو یقین ہے کہ یہ تمام کوششیں بیکار ہیں اور غلط فہمی خواہ کتنی ہی سخت ہو لیکن انسان کی بینائی نہیں چھین سکتی - گزشتہ اجلاس کی کامیابی و ناکامی کا اندازہ صرف اس چیز سے کیا جا سکتا ہے کہ اجلاس کا مقصود اصلی کیا

بت روک سکا جس کے چہرے پر نقاب رہتا ہے اور نہ اُسے مندر کے وہ پجاری روک سکے جو اُس کے پراسرار حکموں پر رقص عبادت کرتے ہیں۔ لیگ اور کانگرس کے اجلاس ایک شہر میں ہوئے۔ لیگ کے ممبر ہوم رول لیگ میں شریک ہوئے اور ماڈریٹ کانگریسی پارٹی سے زیادہ اظہار جوش کے ساتھ اس کی کاروائی میں حصہ لیا۔ پھر کانگرس میں شریک ہوئے اور ممبران کانگرس لیگ میں آئے۔ یہ چیز فی نفسہ ہماری نظروں میں کوئی ایسی وقیع چیز نہیں ہے مگر چونکہ کانگرس اور مسلمانوں کی تفریق کو ہمیشہ ایک بُت بنا کر مسلمانوں نے پوجا ہے اس لیے اس کا پاش پاش ہونا ہر طرح ایک اہم واقعہ ہونے کی استعداد رکھتا ہے۔

اس سے بھی اہم تر چیز یہ تھی کہ مسلمانوں کے سیاسی مجمع سے ایک ایسی آواز اُٹھے جس میں کچھ جان ہو اور جس کی روح کو وقت کا فرضی اور وہمی ہول اُٹھا کر ہلاک نہ کیا جا سکے۔ سو اس میں کوئی شک نہیں کہ مسٹر مظہر الحق کا ایڈریس اس اعتبار سے لیگ کی تمام تاریخ کا حاصل زندگی ہے۔ اور باوجود ہجوم مشکلات و احاطۂ موانع کے انھوں نے جس قدر بھی اظہار حقیقت کی توفیق پائی وہ ہمیشہ یاد رہے گی۔

اب اس کے بعد واقعات پر نظر ڈالیے اور دیکھئے کہ یہ تمام مفسدانہ ساز و سامان جو راضی نامہ کے بعد بھی جاری رکھے گئے اس مقصد اصل کو کہاں تک نقصان پہنچا سکے جو لیگ کے انعقاد سے مقصود اصلی تھا؟

آل انڈیا مسلم لیگ اس کے کاموں، اس کی کارکن جماعت اور اس کے سرپرستوں کے طریق عمل کے متعلق ابتدا سے ہماری ایک خاص طرح کی رائے رہی ہے۔ اور جو اُن دونوں جماعتوں کے افکار سے بالکل مختلف ہے جن کو موجودہ لیگ کے موافقین اور مخالفین کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ بایں ہمہ ہم یقینی طور پر دیکھ رہے ہیں کہ لیگ کے آغاز وجود سے لے کر اس وقت تک اگر اس کا کوئی اجتماع ایسا ہوا ہے جس کو نسبتاً مفید و کامیاب کہا جا سکے تو وہ یہی عجیب و غریب اجتماع تھا جو باوجود ان تمام مفسدانہ طاقتوں اور مفسدانہ ساز و سامان مقاومت کے ساحل بمبئی پر منعقد ہوا۔

انعقاد کا پہلا مقصد یہ تھا کہ ہندو مسلمانوں کے مکمل اتحاد کی طرف ایک زیادہ نمایاں اور موثر قدم بڑھایا جائے۔ اس کو کوئی قوت فساد نہ روک سکی۔ نہ افساد و اضلال کی طاقتوں کا وہ سب سے بڑا ہولناک

مجوّزہ شیعہ کالج (افکار و حوادث)

(البلاغ ۱۸ فروری ۱۹۱۶ء)

گذشتہ جنوری میں "مجوزہ شیعہ کالج" کا جو وفد ہز آنر سر جیمس مسٹن بہادر کی خدمت میں بمقام لکھنؤ پیش ہوا تھا اُس کی روئداد اب تک رسالہ کی شکل میں شائع کی گئی ہے۔ روئداد کا خلاصہ یہ ہے کہ ۱۴ جنوری کو گورنمنٹ ہاؤس لکھنؤ میں ایڈریس پیش کیا گیا اور اُس کے جواب میں خطاب ملوکانہ ہمایونی نے عرض و نیاز کے ایک ایک لفظ کو خلعت قبولیت پذیرائی عطا فرمایا۔

دیدارہم میسر و بوس و کنارہم
از بخت شکر دارم و از روزگار ہم

ادھر عرض نیاز کی ارادت کیشی تھی تو اُدھر نگاہ مہر و کرم کی عجز پروری ادھر عشق کام طلب کی امید واری تو ادھر حسن عشق نواز کی کام فرمائی۔ ادھر

اُن کے ایڈریس میں جو کچھ موجود ہے وہ بلحاظ وقت کی مشکلات کے اس قدر وقیع ہے کہ اس کی رفعت پر غیر موجود کا افسوس غالب نہیں آسکتا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

ہیں اور یہاں سب سے بڑی دلیل اور سب سے چاہنے والوں کی چاہتیں اسی کے لیے ہیں۔ خود کسی کی شیفتگی کو اپنی چاہتوں کے لیے چھانٹ لے۔ پھر جس کو خود وہ چاہے اس کی قسمت کا کیا پوچھنا کہ عشق کی شہنشاہی اور اقلیم حسن کی فرماں روائی ہے۔ بن پڑے تو اپنی چاہتوں میں اس خوش نصیب کو بھی شامل کر لیجئے کہ محبوب کا محبوب بھی محبوب ہوتا ہے اور مذہب عشق کا منتہائے کمال یہی ہے۔

چاہیئے اچھوں کو جتنا چاہیئے
وہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیئے

مرحوم ذوق کی غزلوں میں اپنا ذوق بہت کم پاتا ہوں تاہم ایک شعر ان کا بھی یاد آگیا۔

تم جسے یاد کرو پھر اُسے کیا یاد رہے
نہ خدائی کی ہو پروا نہ خدا یاد رہے

اردو شاعری میں جس چیز کو "معاملہ گوئی" کہتے ہیں۔ شعرائے ایران اُسے "وقوعہ گوئی" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اواخر عہد صفویہ میں فغانی کے سکول نے جو شعرا پیدا کیے۔ اُنھوں نے خاص طور پر اس رنگ کو بہت ترقی دی۔

"ادعونی" کی تعمیل میں دست دعا دراز تھا تو ادھر وعدہ "استجب لکم" کی تصدیق میں دروازۂ استجابت باز۔ ایک طرف سراسر عشق تھا۔ دوسری طرف سراسر حسن۔

وجود او ہمہ حسن ست و ہستیم ہمہ عشق
بہ بخت دشمن و اقبالِ دوست سوگند ست!

ہم دراہ کوچۂ عشق کے واقف کار جانتے ہیں کہ یہاں حق و ہنر کا سوال کام نہیں دیتا۔ بلکہ اسی دنیا کا سارا دار و مدار محض بخشش و کرم پر ہے۔ اس کی نظریں جس پر پڑ جائیں اور اُس کی بے نیازی جس کو سرفراز کر دے وہی سب سے زیادہ مستحق اور اُسی میں سب سے بڑا ہنر ہے۔ استحقاق اور ہنر دکھلا کر چاندی اور سونا لیا جا سکتا ہے لیکن محبت کی نظریں اور پیار کی ادائیں نہیں خریدی جا سکتیں۔ ارسطو اگر لیلیٰ کے خیمہ کا پردہ اُٹھاتا اور قیس کی دیوانگی کے مقابلے میں اپنے فن منطق کو پیش کرتا تو آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ کیا جواب ملتا

معمورۂ دلے اگرت ہست باز گوئے
کانجا سخن بہ ملک فریدوں نمے رود

پس عالم حسن و عشق کے کاروبار اور رد و قبول کے احکام دوسرے

نہ میرا یہ منشاء ہے کہ جو بڑی بلیغ کوششیں اب تک مسلمانوں کی ترقی تعلیم کی نسبت کی گئی ہیں ان کی بے قدری کی جائے"۔

لیکن ہم حیران ہیں کہ اس جملے کے کہنے کی کیا ضرورت تھی بھلا ایک منٹ کے لیے بھی کوئی عقل مند ہنر آنر کی نسبت ایسی بدگمانی کر سکتا ہے؟

نہ ہم سمجھے نہ تم آئے کہیں سے
پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے

ہم نے ابھی کہا ہے کہ شیوۂ عشق و کمال شیفتگی یہ ہے کہ معشوق پر حکمرانی نہ کیجئے بلکہ اپنے عشق کو اس کے فرمان حسن کا محکوم کر دیجئے۔ فلسفۂ حسن و عشق کے سب سے بڑے حکیم عرفی شیرازی کا قول فیصل آپ کو معلوم ہے۔

قبول خاطر معشوق شرط دیدار است
بحکم شوق تماشا مکن کہ بے ادبیست

آپ کو اگر دعوئ محبت ہے تو ہر اس شے کو پیار کیجئے جس پر پیارے کی ایک غلط انداز نظر بھی اس نے ڈال دی ہو۔ مذہب عشق کی منزل تفویض یہی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر مدعیان عشق و کمال

ازاں جملہ ضمیری صفاہانی ہے جس کا ایک شعر مجھے نہیں بھولتا۔

چوں بہ بینم کسے از کوئے او دلشاد می آید
فریبے کز وے اوّل خوردہ بودم یاد می آید

اس وفد نے جو ایڈریس پیش کیا تھا وہ اس قدر دلچسپ نہیں جس قدر ایڈریس کا جواب دلچسپ ہے اور ایسا ہونا ضروری تھا۔ عشق خواہ کسی شکل میں ہو، عجز و نیاز کے لیے ہے دلبری و رعنائی کے لیے نہیں ہے یہ خواص حسن کے ہیں۔ اس کا کوئی جلوہ دلبری و نظارہ پروری سے خالی نہیں ہوتا۔ یہ تو وہ چیز ہے کہ اگر بے مہری و غیظ و غضب میں ہے جب بھی پیار کرنے ہی کی چیز ہوتی ہے۔ پھر لطف و نوازش اور بخشش و کرم کی ہوش ربائی کا کیا پوچھنا۔

ساغر کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

ہز آنر اپنے جواب میں فرماتے ہیں

"اس بیان سے میرا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ مجھ کو کسی قوم یا مذہب کے لوگوں کی کوئی خاص رعایت منظور ہے۔

مسئلہ مسلم یونیورسٹی اور علوم معارف جدیدہ

(افکار و حوادث)

(البلاغ ۱۷ ار-۳۱ر مارچ ۱۹۱۶ء)

دنیا کے عجائب و نوائب کی فہرست بڑی طولانی ہے شاہنامہ کے عجیب و غریب سیمرغ سے لے کر گل بکاؤلی کے عجیب الخواص، پھول" تک ایک سے ایک عجیب المخلوقات اور ایک سے ایک محیر العقول ہے!

اگر بابل کے معلق باغ اور مصر قدیم کے پر اسرار مندروں کے قطع نظر کر لیا جاتے جن کی ملکیت کا تاریخ قدیم کو دعوی ہے جب بھی دیوار قہقہہ کی طلسم آرا دیوار، اسکندر اعظم کا اعجوبہ زا چشمہ حیات اور دریائے بخیر حاتم طائی کی خیافانہ سیاحتوں کے انکشافات دنیا کی دلچسپیوں کے لیے کیا کم ہیں۔

تاہم موجودہ زمانہ عقل و دانائی اور تجربہ و مشاہدہ کا عہد ہے لوگ

عشق نے یہی شیوہ اختیار کیا ہے۔ ازاں جملہ مجمع عشاق علی گڑھ (کثرہم اللہ تعالیٰ) ہے باوجودیکہ یہاں کا ہر مجنون دخترِ دستہ تعلیم و مرکز تعلیم کے بارے میں ایک لمحہ کے لیے بھی تحمل رقابت نہ تھا لیکن جونہی نظر مجبوب نے اپنی محبوبیت کا اعلان کر دیا، معاً سب نے ادعا رقابت کی تلوار نیام میں کر لی اور اب فیصلہ سرکار حسن کے آگے سب کی گردنیں خم ہیں۔

سرِ تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

برہان ہو سکتے ہیں اور دنیا میں ایسے دماغ باقی ہیں جو علمی سنجیدگی کے ساتھ ان چیزوں کو پیش کرنے سے نہیں شرماتے، اور ایسے لوگ موجود ہیں جو دلائل و شواہد کی طرح ان کو قبول کر لے سکتے ہیں۔ تو پھر دنیائے قدیم کی کوئی روایت بھی عجیب نہیں اور بلا تامل مان لینا چاہیئے کہ دنیا میں اب بھی وہ تمام عجائب و غرائب ہو سکتے ہیں۔ جو کسی مجہول ماضی میں ہو چکے ہیں۔ اب ہم کو پورا الیقین ہے کہ فردوسی کے سیمرغ سے مایوس ہو جانے کا فیصلہ صحیح نہیں تھا۔ اس کے گھونسلے سے اب بھی "زال" پیدا ہو سکتا ہے۔ کیونکہ یونیورسٹی کے لے لینے سے ہی سب کچھ ہو جائے گا۔ اور اگر آپ کی آنکھیں ہیں تو اس کا صحیح علاج یہ ہے۔ کہ گل بکاؤلی کو تلاش کیجئے کیونکہ حقائق کے ثبوت کا دارومدار اب صرف نقالی، حکم، اطاعت اور خوش اعتقادی و حسنِ ظن پر آکر رہ گیا ہے۔ اور اگر ایسا ہی ہے تو غریب "تاج الملوک" نے کیا خطا کی ہے کہ اس کی مشہور و متواتر روایت کو نظر انداز کر دیا جائے۔

حقیقت میں یہ واقعہ بھی دنیا کے عجائب و نوادر میں سے ہے کہ ایک طرف تو مسلمانوں کو کہا جاتا ہے کہ ان کے تمام امراض کا علاج

کہتے ہیں کہ اب ہم بہت زیادہ عقل مند ہو گئے ہیں اس لیے ان عجیب عجیب قصوں کو نہیں مان سکتے تو اس واقعہ کو تو مان سکتے ہیں کہ مسلم یونیورسٹی بلا توقف لے لینی چاہیئے۔ اس لیے کہ مہاراجہ دربھنگا اور پنڈت مدن موہن مالویہ نے لے لی۔ اور اس لیے کہ لاکھ روپیہ ماہوار ملے گا اور اس لیے کہ علی گڑھ میں ہر سال تقسیم سندات کا عظیم الشان جلسہ منعقد ہو گا۔ اور اس لیے کہ برٹش گورنمنٹ رحمت الٰہی ہے"۔ اور اس لیے کہ "خالقِ اکبر نے ہم کو اس لیے بنایا ہے کہ احکامات اوامر کی تعمیل کریں"۔ اور اس لیے کہ مسلمانوں کی مسلمہ قومی پالیسی گورنمنٹ کے اعتماد پر مبنی ہے۔ اور سب سے آخر مگر سب سے پہلے یہ کہ بنارس کی طرح علی گڑھ کی گلیاں بھی گزشتہ فروری کے عجیب و غریب مناظر و مشاہد کو دیکھ لیں گی اور یہ سب سے بڑی نعمت ہے جس کے لیے کوئی ذی روح اِس کرۂ ارض پر بیقرار ہو سکتا ہے اور سب سے بڑی دولت کونین ہے جو آدم کی اولاد کو دنیا میں مل سکتی ہے۔ وفی ذلك فلیتنافس المتنافسون۔

اگر مسلم یونیورسٹی کے بلا انتظار لے لینے کے یہ حقائق و دقائق دلیل و

کی بخشش عام ہے۔ اور آپ جیسی نہیں مگر سمجھ ہر شخص رکھتا ہے، تو پھر اس کے جواب میں یا تو بگڑ جاتے ہیں کہ تم "مسلم قومی پالیسی" کے دشمن ہو، یا روٹھ جاتے ہیں کہ تم ہماری بات نہیں مانتے یا پھر دلیل پیش کرنے پر آتے ہیں تو یہ فرماتے ہیں کہ بنارس میں لڈو بٹ چکے ہیں۔ تم بھی بے تحاشا دوڑ جاؤ۔

علوم جدید

اصل یہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی کو بلا توقف لے لینے کے متعلق جس قدر مصنفات و اسفار محققین عہد نے شائع کیے ہیں۔ اُن سے مسلم یونیورسٹی کا ہندو یونیورسٹی ایکٹ پر لے لینا ثابت ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو لیکن اس میں تو کچھ شک نہیں کہ ضمناً ایک عظیم الشان کام آخر انجام پا گیا۔ ہمارا اشارہ اس جدید فن منطق کی طرف ہے جو "علمائے مسلم یونیورسٹی" نے مدوّن فرمایا ہے اور جس نے ثابت کر دیا ہے کہ دنیا میں ارسطو سے بڑھ کر آج تک کوئی انسان احمق نہیں ہوا مسکین ارسطو کے وقت سے لے کر اس وقت تک دُنیا اسی عالمگیر غلطی میں مبتلا رہی ہے کہ دعوے اور دلیل میں ربط

ان کی تمام جستجوؤں کا مقصود، ان کی تمام امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز و ملجا مسلم یونیورسٹی ہے اور یہی وہ چیز ہے جو غرناطہ اور قرطبہ اور بغداد اور کیمبرج اور آکسفورڈ اور نہیں معلوم کیا کیا کچھ مسلمانوں کے حوالے کر دے گی۔ دوسری طرف جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اگر یہ متاع اس قدر قیمتی، اس قدر عظیم و اہم، اور اس درجہ موت و حیات ملت کا فیصلہ کرنے والی ہے تو خدارا جلدی نہ کیجئے۔ بغیر کامل جد و جہد اور سعی و کوشش کے خاتمہ نہ کر دیجئے۔ ایک ہی غمزہ و تمکین طلب پر اپنی تمام متاع دل و جان نذر نہ کر دیجئے۔ صبر و استقامت۔ فکر راسخ اور سعی و جہد کامل دنیا میں ہمیشہ عزائم امور کے لیے ایک حقیقت ثانیہ رہے ہیں۔ آپ بھی اُن سے کام لیجئے اور ساتھ ہی اپنی اصلاح حال اور حقیقی و معنوی ترقیات و توسیعات میں سرگرم رہیے کہ اصل کار یہی ہے اور اگر ایسا نہیں ہے اور چند مہینوں یا ایک سال کے اندر آپ کی ساری کائنات سعی و تدبیر غارت جا رہی ہے تو پھر خدارا آہ و واویلا نہ مچائیے، مخفی اور در پردہ کوشش نہ کیجئے۔ یہ تعلقہ داری کا مقدمہ یا جدامجد مرحوم کی وراثت کا جھگڑا نہیں ہے۔ دلائل و حقائق کا مقابلہ ہے سنجیدگی کے ساتھ واقعی دلائل پیش کیجئے۔ دنیا میں عقل و فہم

حکمت برہان ہوگا۔ مثلاً دعوٰی یہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی جن شرائط کے ساتھ اس وقت مل رہی ہے بلا توقف لے لینا چاہیئے کیونکہ اس سے مسلمانوں کا تعلیمی و قومی مقصود حاصل ہو جائے گا۔ دلیل یہ ہے کہ ایک لاکھ روپیہ ماہوار ملتا ہے۔ اب جس وقت تک کوئی شخص روپیہ کی اسی تعدادی اور مقداری حقیقت ثابت کو جھٹلا نہ دے۔ اس وقت تک یہ دعوٰی غلط نہیں ہو سکتا۔

ارسطو نے شاعری کو محاکات کا نتیجہ قرار دیا ہے یعنی وہ کہتا ہے کہ انسان میں بالطبع نقالی کا مادہ موجود ہے۔ وہ جس حالت کو دیکھتا ہے اسی سے منفعلانہ متاثر ہوتا ہے اور اسی کو دہراتا ہے مگر مسئلہ مسلم یونیورسٹی کا محقق کہتا ہے کہ یہ اس قدیم مدعی علم کی سخت کوتاہ نظری تھی شاعری ہی نہیں بلکہ قومی زندگی کے تمام اعمال و افکار علی الخصوص مسئلہ تعلیم و قومیت کا دار و مدار اصول محاکات یعنی نقالی پر ہے۔ دوسروں کو جس طرح کرتے دیکھو اسی طرح خود بھی کرو۔ اگر ایک چیز کو انسانوں کی کوئی بھیڑ کر رہی ہے تو ان کا کرنا بجائے خود ایک دلیل عمل ہے۔ اس کے بعد کسی دلیل کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ مسلمانوں کے تمام قومی و تعلیمی کاموں

کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر یہ کیسا سفیہانہ اور احمقانہ خیال تھا۔

ہمارے محققین کاملین نے اپنی سیف منطق کی پہلی ضرب اسی پر ماری اور ثابت کر دیا کہ اس سے بڑھ کر اور غلط خیال نہیں ہو سکتا۔ دلیل کے لیے صرف ایک ہی شئے ضروری ہے یعنی وہ بلا کسی درمیانی فصل کے معاً دعوے کے بعد کہہ دی جائے۔ اب رہی یہ بات کہ اس میں اور دعوے میں ربط بھی ہو تو ایسا سمجھنا ایک خالص حماقت ہے۔ جس میں بدبخت ارسطو گرفتار تھا۔ اور کچھ ضرور نہیں کہ ہر انسان گرفتار ہو۔

اس سے بڑھ کر ان مباحث حکمیہ وفنیہ نے جس قدیم غلطی کی غلامی سے نوع انسانی کو نجات دلائی وہ "برہان" کی تعریف کا مسئلہ ہے۔ تمام دنیا قدیم وجدید کس درجہ عقل ودانائی سے محروم تھی جب کہ یقین کر رہی تھی کہ "برہان" اس چیز کو کہتے ہیں جس کے مان لینے سے دعویٰ کا مان لینا لازم آجاتا ہے حالانکہ مصنفین صحائف مسلم یونیورسٹی ومدونین اسفار مسئلہ تومی تعلیمی نے (جن میں بڑے بڑے ماہرین فلسفہ تعلیم موجود ہیں) ثابت کر دیا ہے کہ نہ صرف یہ تعریف غلط ہی ہے بلکہ اصل حقیقت بالکل اس کے برعکس ہے۔ دعوے اور برہان میں جس قدر بعد لزومی اسی قدر وہ زیادہ صحیح اور

نہیں بلکہ ذوق و وجدان سے طے کرو تو پھر یونیورسٹی کے متعلق دلیل و برہان کا طلب کرنا کب جائز ہو سکتا ہے؟ اگر خدا کے وجود و صفات کا ثبوت عقل و دلیل سے نہیں بلکہ صرف وجدان و جذبات کے اعتراف سے ملتا ہے تو پھر مسلم یونیورسٹی کی ذات و صفات کے متعلق یہ مغرورانہ کاوش عقل و ذہن کی کیوں ہے؟ وہ مقام دوسرا ہے۔ یہاں عقل کے دعووں سے کام نہیں چلتا۔ اس یونان کدۂ اسرار و معارف کا سب سے بڑا افلاطون وہ ہے جو سب سے زیادہ بے عقلی و نادانی کا اقرار کرے یہاں فلسفۂ عقل کی پرستش نہیں ہوتی۔ اس عالم میں بقراط کی طب، ارسطو کی منطق اور افلاطون کی اشتراقیات سے کہیں زیادہ اس چرواہے کی بے وقوفی مقبول ہے جو مولانا روم کی کائنات قصص و حکایات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ایک جنگل میں ملا تھا اور وہ خدا کو اپنے صحرائی جھونپڑے میں دعوت دینا چاہتا تھا تاکہ اپنی بکریوں کا دودھ پلائے۔

ملتِ عشق از ہمہ دین ہا جداست

عاشقاں را ملت و مذہب خداست

پھر کیا تم نے نہیں سنا کہ خدا کے مقدس نوشتے کیا کہتے ہیں۔ حضرت مسیح

کا مجبوراً اسی حقیقت کو ہونا چاہیئے ان کے لیے نہ تو کوئی چیز سیاہ ہے اور نہ سفید۔ سیاہی اور سفیدی کا معیار دوسروں کا سیاہ و سفید کہنا اور قرار دینا ہے پس مہاراجہ دربھنگہ اور پنڈت مدن موہن مالویہ کی کمیٹی نے کہہ دیا کہ یہ چیز سفید ہے تو اب تمام مسلمانوں کو چاہیئے کہ بے چون و چرا اس کے آگے سر بسجود ہو جائیں اور اگر کوے کو بھی علی گڑھ کی فضا میں اڑتا ہوا دیکھیں تو چیخ اٹھیں کہ بگلا ناچ رہا ہے۔

یہ محققین عہد، ماہرین مسئلہ تعلیم، محرمان اسرار و رموز قومیات و تعلیمات جدیدہ، اور مجددین و مصلحین عصر تعلیمی کی جماعت تھی لیکن ان کے بعد ارباب سلوک و معرفت، و اصحاب حقائق و معارف کا ایک مقدس گروہ سامنے آتا ہے اور علمی طرز بحث کی جگہ عارفانہ انداز بیان کے ساتھ کہتا ہے کہ یہ مقام استدلال و براہین کا نہیں بلکہ محض وجدانیات و جذبات کا ہے۔

گر باستدلال کارے دیں بدے

فخر رازی رازدارِ دینِ بدے

جب مذہب اور مذہب کے اعتقادات جیسی اہم و عظیم چیز کے متعلق غزالی اور رازی کا فتوٰی ہے کہ اس مقام کو استدلال و عقلیات سے

کرتے ہیں کہ جب انکار دلیل کی یہ آخری دلیل امام رازی نے پیش کی تو شیطان نے عاجز و درماندہ ہو کر ایک نعرہ مارا اور راہ فرار اختیار کی کہ اس دلیل کا جواب میرے پاس کوئی نہیں۔ یہی حال دیکھ کر مولانا روم نے کہہ دیا تھا۔

پائے استدلالیاں چوبیں بود
پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

چنانچہ خانقاہ مسلم یونیورسٹی کے پیر طریقت بھی ایسا ہی فرماتے ہیں۔ ارشاد ہوا ہے کہ دلیلوں کا یہ مقام نہیں۔ بغیر کسی دلیل کے ہم کہتے ہیں کہ مسلم یونیورسٹی کو جلد سے جلد لے لینا چاہیئے اور حق اسی میں ہے۔ اگر معلم الملکوت اس آخری ملکوتی ولاہوتی دلیل کو سن کر چیخ اٹھا تھا، تو اے ہزار حسرت و افسوس انسان کے قلب غافل پر۔ اگر اس دلیل کو سن کر بے اختیار رو نہ پڑے۔

نیز فرمایا کہ مسلم یونیورسٹی کا مسئلہ دلائل و شواہد سے تعلق نہیں رکھتا۔ بلکہ ایک لمحۂ تصور سے عبارت ہے جو صلح اعتقاد اور صافی و پاک ذہن کے ساتھ بسر کر جائے۔ دنیا کی تمام اشیاء و موجودات کا منشاء

نے عقل کا دعویٰ کرنے والوں کو "سانپ کے بچوں" کا تاریخی لقب عطا فرمایا اور کہا کہ "تو آسمان کی بادشاہت میں داخل نہیں ہو سکتا جب تک زمین پر سب سے زیادہ نادان و بے عقل نہ بن جائے۔

نازکی نہ بود رہپے بہ منزلِ مقصود
مگر طریق رہش از سرِ نیازکنی

مشہور ہے کہ امام فخر الدین رازی نے دو سو دلیلیں خدا تعالیٰ کے وجود کے اثبات میں جمع کی تھیں۔ اور اعلان کر دیا تھا کہ ہم نے اس راہ کو عقل کی راہنمائی میں طے کر لیا۔ یہ خبر سن کر شیطان نے اپنا بھیس بدلا اور مجلس درس میں آکر امام رازی سے مباحثہ شروع کر دیا۔ جو دلیلیں انھوں نے تمام عمر کی فکر و کاوش سے قائم کی تھیں، یکے بعد دیگرے پیش کرتے اور شیطان ایک دو اعتراض کر کے ان کو باطل کر دیتا۔ یہ حال دیکھ کر امام صاحب بہت پریشان ہوئے اور اللہ کے حضور اپنے عجز کا اقرار کیا۔ خواب میں دیکھا کہ ایک شخص کہہ رہا ہے۔ "اب دلیلوں کو چھوڑ دو۔ یہ دلیل و استدلال کا مقام نہیں ہے۔ یوں کہو کہ بغیر کسی دلیل کے کہتا ہوں کہ خدا ہے اور اس کو کوئی جھٹلا نہیں سکتا"۔ بزرگانِ طریقت روایت

اُس کے عشق جنوں آور سے مست والیعقل نہ ہو جائے؟ یونیورسٹی سے پیش کردہ ہزارہا نقائص ایک طرف، اور اسی منظر قومی تعلیمی کا نظارہ ایک لمحہ ایک طرف! اگر مسلم یونیورسٹی میں اور کچھ نہ ہوتا اور صرف سال بھر میں ایک بار اِسی منظر جاں نواز و مشہد روح پرور کا ایک نظارہ نصیب آجاتا، جب بھی یہ سودا اس قدر ارزاں تھا، گویا گردو خاک کی ایک مٹھی دے کر بہشت شداد مول لے لی!

البتہ یہ ایک خالص "تعلیمی مسئلہ" ہے اور اس کو صرف عرفاء تعلیم و کاملین حقائق قومیہ ہی سمجھ سکتے ہیں۔ شرف قزوینی نے انہی حقائق و معارف کے متعلق کہا ہے۔

بیا کہ مسئلہ عشق ازاں دقیق تر ست
کہ حل شود شرف از فکر باطل ہمہ کس

نامحرمانِ اسرار کا یہاں گذر نہیں
لیکن زمین را آسمانے دیگر است

بعض ارباب اشارات و اصحاب معارف سے یہ بھی منقول ہے کہ اگر قوم کی دیدۂ بصیرت بینا ہوتی تو بنارس ہندو یونیورسٹی کا

آنکھیں کھول کر کرتے ہیں۔ مگر یہ وہ سرلا ہوتی و رمز نا سوتی ہے۔ جس کا مشاہدہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا۔ جب تک آنکھیں اچھی طرح بند نہ کر لیجئے۔

ہاں آنکھیں بند کیجئے اور چشم تصور سے کام لیجئے مسلم یونیورسٹی قائم ہو چکی ہے اور سینٹ ہال میں تقسیم انعامات و سندات کا عظیم الشان جلسہ منعقد ہے۔ ایک مسلمان والیٔ ریاست یا کوئی بڑی قومی شخصیت جس کے چانسلر ہونے کے گورنمنٹ گزٹ نے اعلان کر دیا ہے، باکمال شوکت و ابہت و با یک دنیا عظمت و رفعت، سریر آرائے مسند چانسلری ہے۔ تمام معلمین و اساتذۂ یونیورسٹی کی جماعت اپنے مدارج علمیہ کے مطابق شاندار اور طویل الذیل جُبّے پہنے ہوئے تمکنت افلاطونی، عظمت سقراطی اور شانِ یونانی و رومانی کے ساتھ یمین و شمال رونق افزا ہے اور یکے بعد دیگرے حاملین علوم و فنون مراتب عالیہ تعلیمیہ کے مقدس غول بڑھتے ہیں۔ اور سند بکف اور جُبّہ بدوش ہو کر واپس جاتے ہیں۔ اللہ! اللہ! کون ہے جو ایک لمحہ کے لئے بھی اس بہشت تعلیمی و جنت قومی کے منظر روح پرور کو دیکھ لے اور پھر

نے سیکھ لیے ہیں، حالانکہ حقیقتاً یونیورسٹی نہ تو ان جزئیات وفروعات میں ہے اور نہ اختیارات کا مسئلہ فی نفسہ کوئی قابل توجہ شے ہے۔ اصل حقیقت تو وہ نقرئی ہتھوڑا تھا جس سے بنارس میں ہندو یونیورسٹی کا سنگِ بنیاد نصب کیا گیا، اور اگر ایک ایسے ہی نقرئی ہتھوڑے کی باعظمت ضرب سرزمین علی گڑھ کو نصیب ہو گئی۔ تو ساری مشکلیں حل، اور ساری امید دل کے لیے پیام بشارت ہے!

:،:،:،:،:،:،:،:،:

گذشتہ جلسہ فہم حقیقت کے بے بس کرتا تھا سبحان اللہ! کیسا عجیب و غریب منظر تھا جو چشم فلک نے پہلی مرتبہ خاکِ ہند میں دیکھا اعظیم الشان والیانِ ریاست کا ہجوم، اعلیٰ ترین حکام و فرماں روایانِ ملک کا اجتماع شوکت و عظمت قومی کا عدیم النظیر مظاہرہ۔ اور تعلیمی فرمانفرمائی خسروی کے عہدِ حکومت کا افتتاح! اس سے بڑھ کر ایک قومی یونیورسٹی کے لیے اور کیا ہو سکتا ہے۔ کیا یہ منظر اس کے لیے کافی نہیں ہے کہ قوم کی آنکھیں کھلیں اور وہ بھی کسی نہ کسی طرح یونیورسٹی سے لینے کے لیے پاگل ہو جائے؟ افسوس کہ قوم میں "ماہرین مسئلہ تعلیم" کا قحط الرجال ہے اور "عملی کام" اور "مسئلہ قومی تعلیم" کے حقائق و اسرار سمجھنے والے ناپید ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ روزِ بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا! لوگ کیسی مضحکہ انگیز غلطی کرتے ہیں جب کہ کہتے ہیں کہ قومی یونیورسٹی کسی بڑے جلسے، کسی بڑے مجموعہ عمارت اور ناموں اور رسموں کے کسی طول و طویل سلسلے کا نام نہیں ہے؟ اور اسم و رسم کا نام نہیں تو اور کس چیز کا نام ہے؟ یہ نادان ہندو یونیورسٹی ایکٹ کو دیکھتے ہیں اور صرف اختیارات، عہدہ وائس چانسلر کی منظوری اور عدم منظوری ریگولیشنز کا انتظار وغیرہ وغیرہ، چند الفاظ انہوں

واقعات ابھی اس قدر پرانے نہیں ہوئے ہیں کہ حافظہ کے لیے تجدید ذکر کی ضرورت ہو۔

نفس تجویز کی ابتدائی تحریک، گورنمنٹ کا اولین مراسلہ، فونڈیشن کمیٹی کا پہلا انعقاد۔ ڈیپوٹیشن کی تشکیل و تکسیت۔ فونڈیشن کمیٹی کا دوسرا اجلاس علی گڑھ، پھر مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن کا قیام علی الخصوص اس کا پچھلا اجلاس، یہ اور نیز ان واقعات وحوادث کے بے شمار اطراف ونتائج نہ صرف مسلم یونیورسٹی نامی کسی مسئلہ کی سرگذشت ہے بلکہ مسلمانوں کی گذشتہ سہ سالہ حیاتِ قومی واجتماعی کی ایک ایسی مکمل تاریخ ہے جس میں اس تین سال کے اندر کی ہر چیز دیکھی اور پڑھی جا سکتی ہے۔

علی الخصوص حق و باطل اور اصلاح وافساد کی باہمی آویزش اور حق کے قدرتی اور لازمی خواص فتح و نصرت کے ظہور اعلان کے لحاظ سے تو مسئلہ مسلم یونیورسٹی کی تاریخ اس درجہ پر عبرت و بصیرت ہے کہ اگر ہندوستان کے اور تمام واقعات وحوادث سے قطع نظر کر لیا جائے تو صرف یہی واقعہ اسی حقیقت کے اعلان کے لیے بس کرتا ہے کہ

افسانۂ زلف یا مسلم یونیورسٹی

(البلاغ ۷ار-۳۱ر مارچ ۱۹۱۶ء)

اولا یرون انہم یفتنون فی کل عام مرۃ او مرتین ثم لا یتوبون ولا ہم یذکرون (توبہ)

کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ کوئی برس ایسا نہیں گزرتا کہ ایک بار یا دو بار بلاؤں میں نہ ڈالے جاتے ہوں۔ پھر بھی ان کی غفلت کا یہ حال ہے کہ نہ تو توبہ کرتے ہیں اور نہ واقعات و حوادث کی تنبیہوں اور سرزنشوں سے نصیحت پکڑتے ہیں۔

رات اور زلف کا یہ افسانہ
قصہ کوتہ ، بڑی کہانی ہے

مسئلۂ مسلم یونیورسٹی کی گذشتہ سہ سالہ تاریخ جن واقعات و حوادث سے عبارت ہے میں ان کو اس وقت بہ تفصیل نہیں دہراؤں گا کیونکہ

غور کرو کہ اس تمام عرصہ کے اندر یکے بعد دیگرے کیسے کیسے واقعات پیش آئے اور کس طرح ہر موقعہ پر حق نے بتلا دیا کہ وہ کہاں ہے اور باطل نے دیکھ لیا کہ خصائص حق کا قانون کس طرح اٹل اور غیر متغیر ہے۔



اس سلسلے میں سب سے پہلے وہ زمانہ یاد آتا ہے جب پہلے پہل مسلم یونیورسٹی کے متعلق دنیا نے معلوم کیا ہے کہ جن امیدوں اور ولولوں میں ان کو مبتلا کیا تھا، ضرور نہیں کہ اصلیت ایسی ہی ہو۔ اس زمانے میں الہلال نیا نیا شائع ہوا تھا۔ اس نے مسلسل چار اشاعتوں میں تعلیمی ممبر کے اولین مراسلہ پر بحث کی اور مسلم یونیورسٹی کی تحریک اور اس کے دعاۃ واعظین کے متعلق خصوصاً اور تمام قومی تحریکوں اور جماعتی کاموں کے متعلق عموماً ان افکار اسلامیہ اور عقائد صحیحہ کا اعلان کیا جن کی صدائوں سے سرزمین ہند کی اسلامی آبادی اس وقت تک آشنا نہ ہوئی تھی۔ یہ سلسلہ مقالات بھی الہلال کے ان ابتدائی مقالات میں سے ہے جنہوں نے مسلمانانِ ہند کے آگے سب سے پہلے اسلام کے احکام

حق جاگ اٹھا ہے اور جب وہ جاگ اُٹھے تو پھر باطل کے لیے امن و لقا نہیں ہے۔



مسئلہ مسلم یونیورسٹی کے واقعہ کو دنیا خواہ کچھ ہی سمجھے مگر میں نے اس میں ایک ہی چیز کو دیکھا اور ہمیشہ اس سے ایک ہی طرح کی صدائیں سُنیں۔ میں نے دیکھا کہ حق و باطل معرکہ آرا ہیں اور گو مختلف صداؤں مختلف ناموں اور مختلف شکلوں میں منظر آرائیاں ہو رہی ہیں مگر ان کے اندر بجز حق و باطل کے مقابلے کے اور کچھ نہیں ہے۔ میری یہ صاف نظارگی بہتوں کو خوش نہ آئی۔ اور بہتوں نے کوشش کی کہ اس قدر صاف لفظوں میں مطلب نہ کہا جائے لیکن میں اپنے مشاہدے کو جھٹلا نہیں سکتا تھا الحمدللہ کہ ابتدا سے لے کر اس وقت تک میں نے جو کچھ دیکھا۔ صاف صاف کہا اور کوئی سعی، کوئی آرزو، کوئی قوت میری نگاہ کو گرد آلود نہ کرسکی۔

بندہ را کہ بفرمانِ خدا راہ رود
نگزارند کہ در بند زلیخا ماند

کی بندش ہر جماعت اور ہر گروہ کے لیے زینت پاؤ گر دان تھیں، اس لیے اس سلسلہ مقالات کا شائع ہونا تھا کہ ہر طرف سے رد و انکار کی صدائیں اُٹھنے لگیں اور ان لوگوں نے جن کی تمام عمر انسانی پرستشوں اور طرح طرح کی دنیاوی طاقتوں کی عبودیتوں میں بسر ہوئی تھی، حیران ہو ہو کے چلانا شروع کیا۔

اجعل الالھۃ الھا واحدا ان ھذا لشیء عجاب۔ (۳۸ : ۵)

کیا اس شخص نے تمام معبودوں سے انکار کر کے صرف ایک ہی معبود قرار دے دیا ہے؟ یہ تو بڑی ہی عجیب بات ہے۔

بعضوں نے سب سے بڑی وجہ انکار یہ بتلائی۔

ما سمعنا بھذا فی الملۃ الاخرۃ ان ھذا الا اختلاق (۳۸ : ۶)

ہم نے ایسی بات تو کبھی اپنی پرانی ملت میں نہ سنی کچھ نہیں۔ یہ اس شخص کی من گھڑت بات ہے۔

بعضوں نے عاجز آ کر وہ آخری صدائے باطل بھی بلند کی جو اُس وقت سے بلند ہوتی آئی ہے جب سے حق کی دعوت اور پکار موجود ہے۔

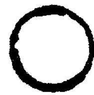
حرقوہ وانصروا الھتکم اس کو جلا دو! اس کو ہلاک کر دو اور اپنے

دینیہ و اوامر شرعیہ کی بنا پر حریت فکر و اجتہاد رائے و دعوت الی الحق و توحید معروف و احتساب شرعی کی دعوت پیش کی، اور جس کو چند مہینوں کے اندر حکمت الٰہی نے وہ فتح مندانہ نشر و اعلان اور خسروانہ قبولیت و رفعت عطا فرمائی کہ وہی دعوۃ۔ وہی پکار، وہی الفاظ وہی جملے، وہی ترکیبیں، وہی عقاید، ہزاروں انسانوں، صدہا جماعتوں بڑی بڑی آبادیوں، بڑے بڑے شہروں بلکہ مسلمانانِ ہند کے سب سے زیادہ وسیع و غالب حصے کی زبانوں سے نکلنے لگے حتیٰ کہ بہت سے ایسے لوگ بھی جو اس وقت دعوۃ الہلال کے رشد شدید منکرین و ماجدین میں سے تھے۔ دوسرے ناموں اور بھیسوں میں آکر انہی عقاید کا وعظ کرنے لگے اور سلطانِ حق کی قہرمانیت و شہنشائیت کے آگے سربسجود ہو جانے کے لیے مجبور ہو گئے۔

گر گفتۂ زعشق گہے حرف آشنا
آں ہم حکائتیست کہ از من شنیدۂ

چونکہ اس وقت تک انقلابی دور دعوۃ شروع نہیں ہوا تھا اور استعداد فکر، و اسر ذہن و تقلید اشخاص، و اتباع افکار ما لوفہ و متواتر

ان سوالوں کا جواب ہندوستان کے زمین و آسمان سے پوچھو۔ خاکِ ہند کے ایک ایک ذرہ سے پوچھو۔ ہر اُس ستارے سے پوچھو جو گذشتہ تین سال کے اندر ہندوستان کی راتوں میں نکلا اور آفتاب کی ہر اس کرن سے پوچھو جو پچھلے تین سالوں کی ہر صبح کو چمکی اور ہر شام کو غروب ہوئی اور اگر یہ تمام صدائیں بھی اس کے لیے کافی نہ ہوں تو پھر خود انہی ہستیوں کے پاس جاؤ جنہوں نے صدائے حق کے انکار و جحود میں منکرین سابقین اور جاحدین اقدمین سے اپنا رشتہ جوڑا ہے، اور ان کے پہلوؤں کے اندر اُتر کے دیکھو کہ دل کا ایک ایک گوشہ اور اُس کی گہرائی میں کا ایک ایک ریشہ کیا کہہ رہا ہے؟ کس ناکامی کا داغ ہے اور کس نامرادی کا ماتم۔



اس عہد کے بعد ہی نہ صرف مسلم یونیورسٹی کی تاریخ، بلکہ مسلمانانِ ہند کے اعمال و افکار عمومی کی تاریخ کا وہ مشہور اور یادگار واقعہ پیش آیا، جو بصیرتوں کا ایک صحیفہ، عبرتوں کا ایک سرچشمہ اور قلوب مومنین و ارواح صادقین کے لیے موعظتوں اور حکمتوں کی روشنیوں کا ایک آفتاب

ان کنتم فاعلین۔ معبودوں کی مدد کرو اگر تم تعیقت میں کچھ کرنے
(۲۱: ۶۸) والے ہو۔

حتیٰ کہ بعض ایسے مخصوص افراد بھی جن کے افکار و عزائم میں تبدیلی ہو چکی تھی اور آزاد بیانیوں کی راہ پر چلنا چاہتے تھے۔ یکایک قدیم اثرات سے پاک نہ ہو سکے اور الہلال کی صدائیں ابتدا ابتدا میں انھیں بھی خوش نہ آئیں۔ لیکن پھر غور کرو کہ چند دنوں کے بعد ہی ان حالات کا نتیجہ کیا نکلا؟ دنیا کی اُن نظروں نے جو ایک غیر معلوم مدت سے حق و باطل کے ان گنت معرکے دیکھ چکی ہیں۔ اس معرکے میں بھی کیا دیکھا؟ کس کے ساتھ اللہ تھا جس نے اس کو تنزل کی جگہ عروج، ادبار کی جگہ اقدام، شکست کی جگہ فتح، اور ذلت و رسوائی کی جگہ عظمت و رفعت بخشی؟ اور کون تھے جن کو روز بروز ناکامی و نامرادی اور ذلت و خسران کے سوا اور کچھ ہاتھ نہ آیا؟ کس کے ساتھ سچائی جو ہمیشہ "لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون" اور "لھم البشری فی الحیوۃ الدنیا وفی الاخرۃ" کا مصداق رہا ہے۔ اور کون رشتۂ حق و صدق سے محروم تھا جس نے ان الباطل کان ذھوقا کے سوا اور کچھ نہ پایا۔ اس کا جواب میں خود نہ دوں گا۔

سرمستی کی رات اس پر بھی ختم نہ ہوئی اور حق پرستی کی راہ اس طرح اُن کے سامنے سے گم ہوئی کہ ایسی واضح اور آشکار راہنمائیوں کے بعد بھی صراط مستقیم پر قدم نہ رکھ سکے۔ ما یاتیھم من ایات ربھم الا کانوا عنھا معرضین۔

کیا یہ ممکن ہے کہ ایک صحیح الفکر و ماغ اسی واقعہ کو دیکھے اور پھر بھی معلوم نہ کر سکے کہ خدا کیا چاہتا ہے؟ ہزارہا انسان ہیں جنہوں نے ابھی اس منظر کو نہیں بھلایا ہوگا جب کہ ۲۸ دسمبر کی صبح کو فونڈیشن کمیٹی کے اجلاس کی آخری نشست ہوئی ہے اور یہ ریزولیوشن بالاتفاق رائے پاس کرانا چاہا ہے کہ ۲۶ آدمیوں کی ایک جماعت کو اسی مسئلہ کے رد و قبول کا پورا اختیار دے دیا جائے۔ کیسا مغرورانہ اعلان، کیسا فتح مندانہ گھمنڈ، کیسا مالکانہ حکم اور کس درجہ شادمانی و مسرت کا بیخودانہ و سرشارانہ جوش و خروش تھا جب دو روز کی متصل مخفی تدابیر کے بعد طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلانے کا کام انجام کو پہنچا یا گیا۔ اور بظاہر اُس پورے مجمع میں مجھ کو اپنی صدائے حق کے اعلان و انداز کے لیے تن تنہا چھوڑ دیا گیا؟ پھر وہ یادگار اور نا قابل فراموش گھڑی، جب میری آواز کو قریب

عالمتاب تھا۔

لمن کان لہ قلب او القی السمع وھو شھید (۵۰ : ۲۲) یعنی
فونڈیشن کمیٹی کا پہلا اجلاس جو ۲۲ دسمبر ۱۹۱۳ء کو قیصر باغ لکھنؤ میں منعقد
ہوا۔ آہ، کیا دنیا میں ایسی غفلتیں بھی بستی ہیں جن کے جگانے کے لیے
زلزلوں اور آتش فشانیوں کے دھماکے بھی بیکار ہوتے ہیں اور کیا ایسی
آنکھیں بھی موجود ہیں جن کے لیے دوپہر کے سورج میں بھی روشنی نہیں؟
فونڈیشن کمیٹی کا یہ اجلاس اور اس کے نتائج و عواقب ظاہرہ، اعلان
حق و فتح صداقت کا ایک ایسا تاریخی واقعہ تھا کہ اگر لوگوں کے دلوں
کو حق و انابت اور خشیت ایمانی کا ایک ذرۂ احساس بھی ملا ہوتا تو ہدایت
یابی اور توبہ و رجوع الی الحق کے لیے صرف یہی ایک واقعہ بس کرتا تھا
وہ سمجھ جاتے کہ حق کس کے ساتھ ہے اور اللہ کی مشیت کا ہاتھ کس کی جانب
سے حرکت کر رہا ہے؟ وہ اعلان و ظہور اور انقلاب ذلت و اذکار کی روشنیوں
کی ایک ایسی مجلی دوپہر تھی کہ اندھوں کو بھی راہ مل جاتی تھی اور نہ خانوں کو
بھی روشنی سے چمک اٹھنا تھا۔ لیکن افسوس انسان کی غفلت پر اور صد
حسرت دلوں کے امراض اور عقلوں کی ضلالت پر کہ سرگشتگانِ خواب و

یکایک نمایاں ہوئی اور ھموا بہ نالم بیتالوائے قانون فطرت نے ظاہر ہو کر بتلا دیا کہ فتح کس کے لیے اور شکست کے لیے کون ہے؟ اور پھر کیا یہ سچ نہیں ہے کہ جو ریزولیوشن اس درجہ غرور اسکندری اور نشاط جمشیدی کے ساتھ پاس کیا گیا تھا بالآخر نامرد و خاسر ہوا۔ اور جس ڈیپوٹیشن کی ولولہ انگیز محنتوں اور مشقتوں سے چنی گئی تھی اس کو خود ہی اپنے ہاتھوں گرانا پڑا۔ اللہ اللہ اُس قدوس حکیم کی مصلحتیں اور اُس حی و قیوم کی قدرتیں، جن ہاتھوں نے اُس ڈیپوٹیشن کی تجویز کی کامیابی پر خوشیوں سے مست ہو کر دس دس منٹ تک متصل تالیاں بجائی تھیں اُنہی ہاتھوں کو ہیں نے دیکھا کہ زمین کھود رہے ہیں اور اس چار ماہ طفل نو مولود کو سپرد خاک کر رہے ہیں!! اگر عقل مر نہ گئی ہو اور ایمان باللہ کی روح نے جسم کو چھوڑ نہ دیا ہو، تو کلمہ حق و صدق کی کامیابی اور دعوۃ الہلال کی فتح مندی کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا نشانی ہو سکتی ہے۔

لیکن ومن یجعل اللہ لہ نوراً فما لہ من نور



لیکن مسئلہ مسلم یونیورسٹی کی تاریخ اس واقعہ پر پہنچ کر ختم نہیں ہو جاتی اگر

خوردہ مجمع نے قبول نہ کیا اور نادان انسان یہ نہ سمجھے کہ جس آواز کو اس وقت
رد کر رہے ہیں، قریب ہے کہ اس کے سننے، اس کے ماننے اور اس کی
اطاعت کرنے کے لیے ان کو بے قرار ہونا پڑے گا۔ اس کے بعد اُن قابل
رحم روحوں کا شور وغل جن کے اندر بجز نادانی، غلط فہمی اور سوء فہم کے اور
کچھ نہ تھا۔ اور ساتھ ہی ریزولیوشن کے پاس کرنے کا بادشاہانہ اعلان
جس نے خوشیوں اور شادمانیوں کی مستی سے نادانوں اور بے خبروں کو
متوالا کر دیا تھا۔ وزین ذلك فی قلوبکم وظننتم ظن السوء
وکنتم قوما بورا (۴۸ : ۱۲)

باایں ہمہ نتیجہ کیا نکلا؟ فتح مندیوں اور کامرانیوں کے اس اعلان
نے کتنی عمر پائی؟ کامیابی و نصرت کا یہ گھمنڈ جس نے اپنی بڑائی کا اعلان
کیا تھا۔ حالانکہ بڑا صرف خدا ہے، کتنی مدت تک زندگی پا سکا؟
بلاشبہ ۲۸ کی صبح کو چند سو آدمیوں کے مجمع میں مجھ کو شکست دے دی
گئی لیکن اس کے بعد کتنی صبحیں فتح و کامیابی کی نصیب ہوئیں، اور یہ صبح
صرف ۲۸ دسمبر ہی کی نہ تھی؟ کیا ایسا نہیں ہوا کہ ابھی پورے چار مہینے
بھی نہیں گذرے تھے کہ العاقبۃ للمتقین کی قدوسیت و جبروتیت

کے کچھ بھی نہ کر سکے۔ اور داعیانِ حق نے جو کچھ چاہا وہی ہوا۔ ولکم فیہا ما تشتہی انفسکم ولکم فیہا ما تدعون۔

پھر اسی جلسہ میں مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن قائم کی گئی۔ اور اس کے ضمن میں متعدد جنبلی واقعات پیش آئے۔ مگر ہر جزئی سے جزئی واقعہ میں بھی قوت حق وغلبہ آراء ملت کی طاقت اپنے آثار روشن و ظاہر دکھلاتی رہی۔ اور اس میدان کے کسی گوشہ نے بھی اُن کو پناہ نہ دی تھی کہ گذشتہ اجلاس ایسوسی ایشن کا آخری واقعہ پیش آیا جس میں مخفی طیاریوں اور درپردہ تدبیروں کو منتہا سعی تک پہنچا دیا گیا۔ جنگ کے زمانے کے شدید اثرات بعض آزاد خیال افراد کی نظر بندیاں، ایک عرصہ کے التواء خاموشی کی وجہ سے عام طور پر دلوں کی افسردگی، جنگ کے زمانے کی وجہ سے آزادانہ خیالات کے اظہار کی عام طور پر بندیش۔ اور بہت سے ایسے وقتی حالات واسباب پیش نظر تھے جن کی وجہ سے ان لوگوں کو پورا یقین ہو گیا تھا کہ موجود فرصت حصول مقصد کے لیے سب سے زیادہ قیمتی ہے۔ اور کچھ عجب نہیں کہ شملہ کے وعدے علی گڑھ کی کوششوں سے پورے ہو جائیں اس اجلاس کے انعقاد کی سرگزشت بھی اس سے کم دلچسپ نہیں ہے

انسان غفلت حق کی طاقت کو بار بار آزمانا چاہتا ہے تو حق بھی اپنے خواص کے بار بار اظہار کا اعلان سے نہیں تھکتا۔ فونڈیشن کمیٹی کے اولین جلاس اور مجوزہ ڈیپوٹیشن کے حادثہ نے اگرچہ بتلا دیا تھا کہ آگ کا خاصا حرارت ہے اور اس کے چھونے سے ہاتھ جل جاتا ہے لیکن نادانوں نے چاہا کہ انگاروں سے کھیلنے کا تجربہ ابھی اور جاری رکھیں۔ چنانچہ اس کے بعد علی گڑھ میں فونڈیشن کمیٹی کا دوسرا اجلاس کیا گیا۔ بڑوں بڑوں نے بڑی بڑی کوششوں اور تدبیروں سے وہ اپنے ہم مشرب اشخاص مختلف اطراف ہند سے جمع کیے گیے۔ خاص علی گڑھ میں جلسہ منعقد کرکے یقین کیا گیا کہ ہمارے دارالخلافہ کے اندر آکر باہر کی کوئی جماعت کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ظنوا انہم مانعتہم حصونہم من اللہ۔ انھوں نے گمان کیا کہ ہمارے قلعہ کی عمارتیں اللہ کی طاقت کو آنے سے روک دیں گی۔ فاتاہم اللہ من حیث لم یحتسبوا۔ پس خدا اسی راستے آیا۔ جہاں سے ظہور طاقت کا انھیں گمان بھی نہ تھا۔ وقذف فی قلوبہم الرعب۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اپنے حصار و لشکر کے اندر جلسہ کرکے بھی وہ ناکام رہے اور کلمہ حق کی ہیبت اس طرح ان کے دلوں پر چھا گئی کہ باوجود کمال جد و جہد



اب ۱۰ اپریل کو پھر فونڈیشن کمیٹی کا اجلاس لکھنؤ میں منعقد کیا گیا ہے اور یہ لوگ تین سال کے متواتر و مسلسل تجربہ کے بعد اب پھر اُٹھے ہیں کہ خدا کو اور اُس کے کلمۂ حق کی قوت کو ایک بار اور آزمالیں۔ یہ محض فونڈیشن کمیٹی کا ایک مجمع ہی نہیں ہے بلکہ اُن کوششوں اور تدبیروں کی انتہا ہے جو مشیت الٰہی کے مقابلے میں انسانوں کا کوئی گروہ کر سکتا ہے۔ ان لوگوں نے سمجھا ہے کہ اگر ہم ایک مرتبہ آخری جانبازانہ کوششوں کا سامان اور کرلیں گے تو ضرور خدا کو شکست دے دیں گے کیونکہ انسانوں کی طرح لڑتے لڑتے وہ بھی تھک جا سکتا ہے اور اگر بہت زیادہ روپیہ، بہت زیادہ سازشیں، بہت زیادہ انسان اور بہت زیادہ انسانی تدبیروں کا مواد جمع کر لیا جا سکے تو کیوں نہیں خدا کو بھی ہار ماننی پڑے! چنانچہ مہینوں سے طرح طرح کے سامان کیے جا رہے ہیں اور بڑے بڑے دعوے اور بڑے بڑے اعلانات سننے میں آ رہے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس آخری معرکے کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ کیا کلمۂ حق و جماعت کی پچھلی فتح مندیاں صرف اس لیے تھیں کہ بہت زیادہ سامان اس کے حریفوں نے نہیں کیا

جس قدر اجلاس کے اندر کے واقعات دلچسپ ہیں۔ دوسری فونڈیشن کمیٹی میں طے پا یا تھا کہ ایک ڈیپوٹیشن آخری گفتگو کے لیے والسرائے ہند کی خدمت میں حاضر ہو۔ اب اس کے تمام مراتب ابتدائی طے پا چکے تھے لیکن صورت حال یوں ٹھہرائی گئی کہ گویا ڈیپوٹیشن کے آنے کی اسی طرف سے درخواست کی گئی ہے۔ اور وہاں سے جواب صاف مل گیا ہے کہ جب تک اصول شرائط ہندو یونیورسٹی کے منظور نہ کر لیے جائیں اس وقت تک ڈیپوٹیشن کا آنا بیکار ہے۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ مسلمانوں کے سامنے یونیورسٹی کا مسئلہ آخری رد وقبول کی شکل میں آجائے اور لوگ گھبرا کے اور پریشان ہو کے فیصلہ کر دیں کہ جب اس طرح دوٹوک جواب مل گیا ہے تو اب لے لینے کے سوا چارہ نہیں۔

لیکن با ایں ہمہ اس سعی کا بھی جو نتیجہ نکلا وہ دنیا کو معلوم ہے۔ بالآخر اسی ناکامی نے اُن کا استقبال کیا جو اولین اجلاس فونڈیشن کمیٹی سے ان کی رفیق حال وہمدم اعمال ہے۔ اور بجز اس کے ماتموں میں ایک نئے ماتم کا اور حسرتوں میں ایک نئی حسرت کا اضافہ ہو گیا، اس پورے گروہ کو اور کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔

انا منتظرون ... (م) کرو، ہم بھی انتظار کرنے والے ہیں۔ اور تمہارا
ربك بغافل عما تعملون پروردگار اُن کاموں سے غافل نہیں جن
میں تم لگے ہوئے ہو۔

دلائل و مباحث

ہمارا ارادہ تھا کہ اس نمبر کا ایک مضمون اُن تمام دلائل و مباحث کے متعلق بھی لکھیں گے جو اس وقت تک مسلم یونیورسٹی کے بلا انتظار لے لینے کے لیے شائع کیے گئے ہیں۔ چنانچہ اُس غرض سے ہم نے ایک پورے فارم کی جگہ خالی رکھی اور تمام کاغذات و رسائل جمع کر دئے جو اس وقت تک شائع کیے جا چکے ہیں۔

لیکن اب کہ لکھنے کا ارادہ کیا ہے۔ اور اُن تمام مضامین و رسائل پر نظر ڈالی ہے جو ابتداء سے لے کر اس وقت تک شائع کیے گئے ہیں علی الخصوص وہ تحریریں جو گذشتہ اجلاس ایسوسی ایشن کے موقعہ پر شائع کی گئیں، نیز وہ بعض رسائل جو پچھلے دو چار ہفتوں کے اندر نکلے ہیں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کس چیز کو دلیل و ثبوت کے لفظ سے موسوم کریں اور

تھا اور اب زیادہ سامان کر کے اس کو شکست دے دی جائے گی؟

یہ سچ ہے کہ صوبۂ متحدہ کی گورنمنٹ نے پچھلے اجلاس ایسوسی ایشن کی شرکت کے بعد ہی مجھ کو اپنے صوبے میں داخل ہونے سے روک دیا ہے اور اس لیے اِس جلسہ میں شریک نہیں ہو سکتا۔ لیکن غالباً خدا کو لکھنؤ میں آنے سے نہیں روک سکتی اور اُس کے آنے اور نمودار ہونے کی راہیں ہمیشہ ایسی رہی ہیں جن کا انسانوں کو وہم و گمان بھی نہ تھا۔ فاتاھم اللہ من حیث لم یحتسبوا۔

یہ وہی حق و باطل کا مقابلہ ہے جو برسوں سے ہو رہا ہے۔ یہ وہی اشخاص اور جماعت کے نوائد کی معرکہ آرائی ہے جس کا میدان عرصہ سے گرم ہے۔ یہ وہی اصلاح اور افساد کی قوت و ضعف کا فیصلہ ہے جو اگرچہ اوّل روز ہی ہو چکا ہے مگر ایک آخری فیصلہ غالباً ابھی باقی ہے پس قریب ہے کہ حق ظاہر ہو اور کچھ دیر نہیں کہ جس کلمہ کے ساتھ اللہ کی مشیت و حکمت شامل ہے وہ اپنی آخری فتح مندی کا اعلان عام کرتے

اعملوا علی مکانتکم اے لوگو! تم اپنی جگہ کام کیے جاؤ۔ ہم انا عاملون۔ وانتظروا اپنی جگہ کام کر رہے ہیں پھر نتیجہ کا انتظار

ثانیاً، ابھی جدید ممبر تعلیمات دہلی کی صحبت میں ظاہر کر چکا ہے کہ ہندو یونیورسٹی کی شرائط پر مسلم یونیورسٹی ہر حال میں طیار ہے۔ آپ جب چاہیں لے سکتے ہیں۔

(۲) دلیل نہیں مگر ایک بڑا مغالطہ یہ دیا جاتا ہے کہ مسلم یونیورسٹی لے لینے کی صورت میں علی گڑھ کالج کی آزادانہ حالت کچھ نہ کچھ بڑھ ہی جاتے گی، گھٹ کسی طرح نہیں سکتی۔ مگر یہ بیان اپنی شدت اور نوعیت کے لحاظ سے ایک ایسا کامل ترین قسم کا جھوٹ ہے جس سے زیادہ غلط بیانی انسان کی زبان نہیں کر سکتی۔ دلیل میں یہ لوگ علی گڑھ کالج کے موجودہ قانون اور ہندو یونیورسٹی ایکٹ کا مقابلہ کرتے ہیں اور بلا دریغ سفید کو سیاہ اور دن کو رات دکھلاتے ہیں۔ علی گڑھ کالج اور گورنمنٹ کے اختیارات کی اصلی بنا قانون ٹرسٹیاں کی دفعہ ۱۶۴ ہے "لوکل گورنمنٹ اور ڈائرکٹر تعلیمات کو کالج کے اندرونی انتظامات اور بورڈنگ ہاؤس کے انتظام اور کالج کے اسٹاف کے تقرر اور موقوفی اور تبادلہ نیز معاملات متعلق تعلیم مذہبی میں بجز اس کے جس کا ذکر دفعہ ۴۴ ب میں ہے مداخلت کرنے کا اختیار ہوگا۔

اس تمام ذخیرۂ اشاعت کی کسی سطر کو قابلِ بحث و مذاکرہ قرار دیں۔ اسی تمام ذخیرہ میں ایک دلیل بھی ایسی نہیں ملتی جو ثابت کر سکے کہ بحالت موجودہ (جب کہ گورنمنٹ آف انڈیا اور گورنمنٹ انگلستان نام نہاد قومی یونیورسٹیوں کے متعلق ایک انقطاعی مقام اختیار کر چکی ہے)۔ چند دنوں کے مزید انتظار، ضوابطِ مہند و یونیورسٹی کی ترتیب، قوانین متعلقہ کار کی نفاذی شکل، اور دوائر نفوذ و احاطہ کے معائنہ میں کونسا نقصان عائد ہو جاتا ہے۔ جس قدر مضامین و رسائل شائع کیے گیے ہیں، بلا شائبہ مبالغہ اُن میں سوائے ضلالتِ فکر و رائے اور تلبیسات و مخادعات کے کچھ نہیں: مثلاً

(۱) ایک بڑی دلیل بار بار پیش کی جاتی ہے، گورنمنٹ کی رائے بدل جائے اور پھر یونیورسٹی نہ ملے لیکن اس بیان میں کئی دھوکے اور مغالطات ہیں۔ اوّل تو قومی یونیورسٹی کے متعلق نہ صرف حکومت ہند بلکہ حکومت بالا بھی اپنی پالیسی صاف واضح کر چکی ہے اور ایک قوم کو دے چکی ہے، اب اس میں تبدیلی کا خوف دلانا ایک ایسی سوفسطائیت ہے جس کو بجز علی گڑھ کے "محققین تعلیم" کے اور کوئی اختیار نہیں کر سکتا

ہوگا کہ مشورہ کا لحاظ کریں عمل نہ کرنے کی وجوہ قلمبند کریں (دفعہ ۱۴۱ ۱، ۱
وزیر (یعنی لفٹننٹ گورنر) مشورہ دینے کا مجاز ہوگا (دفعہ ۱۴۱ الف) وزیر
کو جائز ہے کہ اپنی رائے لکھے۔ کوئی تجویز پیش کرے۔ بورڈ آف مینجمنٹ
کا فرض ہوگا کہ مشورہ پر غور کرے۔ (دفعہ ۱۴۳ ضمن ۲) گورنمنٹ کو اختیار
ہوگا کہ تحقیقات کرے (دفعہ ۱۴۹)۔

اس سے معلوم ہوا کہ موجودہ حالت میں قوانین کالج گورنمنٹ کے
کسی علاقہ کو قانوناً، صلاح و مشورہ، تجاویز، دریافت و تحقیق سے
زیادہ تسلیم نہیں کرتے اور بجائے حسب دفعہ ۱۲۷ اپنے تمام اندرونی
معاملات میں وہ آزاد ہے۔

اس کے مقابلے میں ہندو یونیورسٹی اور اس کی دفعات ہیں
جن کا خلاصہ مختصر لفظوں میں یہ ہے کہ ہر بنیادی و اساسی قوت نہ
صرف رد کر دینے بلکہ منظوری و عدم منظوری کا اختیار گورنمنٹ نے
اپنے ہاتھ میں رکھا ہے، اور ضوابط کی ترتیب بھی جس کے مطابق ہر
صیغہ کام کرے گا، گورنمنٹ ہی کے متعلق ہے۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

دفعہ ۱۰ جس کا اس میں ذکر ہے یہ ہے" لوکل گورنمنٹ کو اختیار ہو گا کہ اس امر کی نسبت اپنا اطمینان کرنے کی غرض سے کالج کا اسٹاف کالج کے طالب علموں کی تعلیمی ضروریات کے لیے کافی ہے، ٹرسٹیوں سے وقتاً فوقتاً استفسار کرے اور اگر استفسار کے بعد گورنمنٹ کو یہ معلوم ہو کہ کالج اسٹاف کا کوئی عہدہ دار اس کام کے قابل نہیں ہے، تو ٹرسٹیوں کو ہدایت کرے گی کہ اس شخص کو اس عہدے سے علیحدہ کر دیا جائے"۔

اِن دفعات سے واضح ہو گیا کہ موجودہ قوانین کی بنا پر لوکل گورنمنٹ کو صرف اس قدر اختیار حاصل ہے کہ اگر کالج کی تعلیمی ضروریات کے لیے کوئی عہدہ دار قابل نہ ہو تو وہ ٹرسٹیوں کو ہدایت کرے گی کہ اس شخص کو اس عہدہ سے علیحدہ کر دیں۔

علاوہ بریں قانونِ ٹرسٹیاں اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ اس میں جس قدر دفعات گورنمنٹ اور عہدہ داران گورنمنٹ کے علائق سے تعلق رکھتی ہیں ان سب میں حسب ذیل الفاظ کے سوا اور کچھ نہیں مل سکتا

"ڈائرکٹر کو ٹرسٹیوں کو صلاح دینے کا اختیار ہو گا۔ ٹرسٹیوں کا فرض

احاطہ کے اندر اسلام کی دعوۃ و تعلیم کے لیے گنجائش ہے یا نہیں۔



صاحبزادہ صاحب کا خط

میں گذشتہ پانچ ہفتوں میں والدہ صاحبہ کی علالت اور اپنے جوان گریجویٹ بھانجے کی علالت اور انتقال کے سبب سخت پریشانیوں میں رہا۔ اور نیز چونکہ آپ کے خط کے مضمون کے متعلق مجھ کو جناب والا آنریری سیکرٹری صاحب کانفرنس اور دیگر ممبروں سے مشورہ کرنا تھا۔ اس لیے جواب میں دیر ہوئی معاف فرماویں

آپ کو معلوم ہے کہ اس کانفرنس کے وجود کا مقصد اور موضوع تعلیمی تحریک کی اشاعت اُن اصول کے مطابق ہے جو سرسید علیہ الرحمۃ نے قائم کی، اور جن پر علی گڑھ کی تحریک مبنی ہے پس کانفرنس کے پلیٹ فارم پر جو کچھ بھی تعلیمی تجاویز پیش ہوں اور اُن کے متعلق جو کچھ تقریریں ہوں ان سب میں اصلی غرض کا ملحوظ رہنا لازمی امر ہے۔ کانفرنس میں جو تعلیمی مسائل یا مسلمانوں کی تعلیمی ضرورتوں کے متعلق جو تجاویز پیش ہوں

آل انڈیا محمڈن کانفرنس اور دعوۃ اسلامی

(البلاغ نمبر ۱ و ۲، ۲۱ جنوری ۱۹۱۶ء)

اواخر نومبر میں اس عاجز نے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں جائنٹ سیکرٹری کانفرنس کو رجسٹرڈ خط کے ذریعے اطلاع دی کہ وہ سالہائے گزشتہ کی طرح امسال بھی کانفرنس کے پروگرام میں میری تقریر کے لیے وقت رکھیں، اور میری تقریر کا موضوع "صراطِ مستقیم" ہوگا۔

اس خط کے جواب میں صاحبزادہ صاحب نے جو خط لکھا، اور اس کے جواب میں جو خط میں نے بھیجا، ان دونوں کی نقل حسبِ ذیل ہے۔ میں بیمار ہوں اور اس اشاعت میں اس کے متعلق اور کچھ نہیں لکھ سکتا۔ آئندہ نمبر میں انشاء اللہ لکھوں گا۔ یہ محض ایک شخصی مسئلہ نہیں ہے بلکہ کانفرنس کے اصول مباحث و مواعظ کا ایک عام سوال پیدا ہو گیا ہے، اور مسلمانوں کو معلوم کرنا چاہیے کہ اس

متوجہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن آپ نے آخری اجلاس میں جو تقریر فرمائی اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ جو اثر کانفرنس کے مقاصد کی تائید میں پیدا ہوا تھا وہ بہت کچھ زائل ہو گیا۔ ایسی حالت میں سب سے اول یہ امر صاف ہو جانا ضروری ہے کہ جس تعلیمی تحریک کی اشاعت کے لیے یہ کانفرنس قائم ہے اور جن اصول کے مطابق اور جن مقاصد کے لیے سر سید علیہ الرحمۃ نے اس کی بنا قائم کی ہے ان کو آپ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے مفید اور ضروری سمجھتے ہیں یا نہیں؟ اور ان کو قوم میں مقبول عام کرانے کی کوشش کرنا کانفرنس کے ممبروں کا فرض تصور کرتے ہیں یا نہیں؟ اس امر کی نسبت جواب آنے پر جناب کے اوّل خط کے متعلق جواب عرض کر دیا جاوے گا۔ والسلام

خاکسار

آفتاب احمد



خط کا جواب

جس دن آپ کا والا نامہ پہنچا، اس دن سے نزلہ و درد گلو میں مبتلا ہوں،

ان سے اتفاق یا اختلاف کرنے کا ہر ایک ممبر کو حق ہے لیکن کانفرنس کے وجود کا جو مقصد اور موضوع ہے اس پر کانفرنس کے پلیٹ فارم پر حملہ کرنے کا کسی کو حق نہیں۔ اس ذرا توجہ کے لیے اب میں آپ کو آپ کی وہ تقریر یاد دلاتا ہوں جو گزشتہ سال راولپنڈی کے اجلاس کانفرنس میں آپ نے فرمائی تھی اور جس میں آپ نے فرمایا تھا کہ کانفرنس کی تعلیمی تحریک، اس قسم کی ہے جیسے کہ کسی مردہ کو مرہم روغن کے ذریعے زندہ کرنے کی کوشش کرنا۔ اس سے مجھ کو بحث نہیں کہ آپ نے جس رائے کا اظہار کیا تھا، وہ صحیح ہے یا کیا ہے لیکن یہ میں ضرور عرض کروں گا کہ کانفرنس کے پلیٹ فارم پر اس قسم کی تقریر قطعاً ان مقاصد کے منافی ہے جن کے لیے یہ کانفرنس قائم ہے۔ سالہا سال کی کوشش کے بعد بڑی مشکلات کا سامنا کر کے راولپنڈی کا اجلاس اس غرض سے کیا گیا تھا کہ سرحد کے مسلمانوں کو تعلیم کی طرف توجہ ہو، اور شمال مغربی اضلاع میں جو اسلامی خطہ ہے اور جو جہل کی تاریکی کی وجہ سے نہایت پستی کی حالت میں ہے، اس میں تعلیم کے ذریعہ سے بیداری کے سامان پیدا ہوں۔ چنانچہ حتی الامکان مختلف تحریکوں اور لیکچروں کے ذریعہ حاضرین کو تعلیمی تحریک کی طرف

نہیں ہونے دیتا۔

ایک چیز آپ کی اور آپ کے ہم خیال بزرگوں کی خواہش ہے اور ایک چیز کسی کام کے اصول و مقصد اور شرائط وغیرہ کا مسئلہ کچھ ضروری نہیں کہ پہلی چیز کی بنیاد ثانی الذکر پر رکھی جاتے۔ آپ اگر دونوں مسئلوں کو الگ رکھتے تو بات زیادہ صاف اور روشن تھی۔

آپ نے کیسی تعجب انگیز غلطی کی ہے جب کہ خود ہی ایک مقدمہ قائم کیا ہے اور قبل اس کے کہ مخاطب اُسے تسلیم کرے یا اُس کا مقدمہ مسلمہ ہونا ثابت ہو جائے، پوری شکل بھی قائم کر لی ہے اور پھر نتیجہ بھی نکال لیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ "کانفرنس کا موضوع تعلیمی ہے" یہ بالکل ٹھیک ہے اور اس کا نام ہی اس کے لیے شاہد

گواہ عاشق صادق در آستیں باشد

لیکن اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ "اُن اصولوں کے مطابق جو سرسید مرحوم نے قائم کیے" گذارش ہے کہ مقدمہ کا یہ ٹکڑا کہاں سے ماخوذ ہے؟ میں اسے تسلیم نہیں کرتا۔ کانفرنس کے مقاصد کی فہرست، دفعات، قواعد، شرائط و ضوابط، عہد اولی کی مجلسیں، ارکان اساسی کی تقریریں

تمام کام معطل ہیں۔ آج تھوڑی سی مہلت ملی تو سب سے پہلے جناب والا یاد آئے۔

افسوس کہ مجھے اُن حوادث کی خبر نہ تھی جن کا ذکر جناب نے آغاز خط میں کیا ہے ورنہ تاخیر جواب کے لیے کسی طرح اظہار شکایت نہ کرتا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون وعظم اللہ اجورکم بمصائبکم

میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے اپنے خیالات صاف صاف ظاہر کردیئے اور اُن مصنوعی اور نمائشی عذرات سے بالکل کام نہ لیا جو آج کل ایسے مواقع میں عموماً اخفاء اصلیت کے لیے کام میں لائے جاتے ہیں یہی شان ایک مسلمان کی تمام معاملات میں ہونی چاہیئے۔ اگر ہم سب ایسا ہی کریں تو نصف اندرونی اختلافات کا خاتمہ ہو جائے۔

لیکن جناب نے اپنے خط میں (معاف فرمایئے گا) ترتیب مقدمات وطرز استدلال کے ایسے متعدد سامحات جائز رکھے ہیں جن کی وجہ سے مجھے عرض جواب میں بڑی ہی مشکل پیش آگئی ہے۔ اگر اُن امور پر لکھتا ہوں تو صفحوں کے صفحے چاہئیں۔ مگر نہ مجھے اس کی مہلت ہے نہ آپ کو۔ اعراض کرتا ہوں۔ تو خلط بحث آپ نے کر دیا ہے، وہ کسی مقصود کو صاف واضح

آپ کے لیے یہ بھی دروازہ باز ہے۔ صراحۃ النص کا تو اصل مطالبہ ہے لیکن خیر دلالۃ النص ہی سہی کسی نہ کسی طرح یہ واضح کر دیجئے کہ جناب کا پیش کردہ اعتقاد فلاں نص سرسید سے ماخوذ ہے۔

یا للعجب! آپ لوگ فخر کرتے ہیں اگر ایک نصرانی کانفرنس کے پلیٹ فارم پر اگر بہت سی ایسی باتیں کہہ جاتے جو آپ کے عقائد و اغراض کے بالکل ضد ہوں، لیکن آپ لوگوں کا اعتقاد یہ ہے کہ کوئی مسلمان اختلاف نہیں کر سکتا؟

پھر کیا آپ کو یاد نہیں رہا کہ آپ کا یہ مقدمہ کس طرح ہمیشہ پامال کیا جا چکا ہے اور کتنی نظریں اس کے لیے مخالف و ضد موجود ہیں۔

کیا بمبئی کانفرنس کے پریذیڈنٹ مسٹر بدرالدین طیب جی نہیں بنائے گیے جو کہ سر علی گڑھ تحریک ہی کے مخالف تھے۔ کیا انھوں نے اپنے افتتاحی ایڈریس کے اندر وہ کچھ نہ کہا جو سرسید مرحوم کے مشن اور عقاید و اصول تعلیم کے سرتاسر خلاف تھا؟ اُن سے یہ شرط نہیں کرائی گئی۔ سرسید مرحوم پردۂ نسواں کے اس قدر اشد شدید حامی تھے اور خارجی تعلیم نسواں کے ولولوں پر کیسے غضب ناک ہو جاتے تھے؟ حتیٰ کہ میر ممتاز علی کے

خود سید صاحب کی تقریر جو انھوں نے علی گڑھ کے دونوں جلسوں میں اور لکھنؤ میں کی، نیز اس کی تمام رپورٹیں، یہ تمام ذخیرہ موجود ہے میں بہت ممنون ہوں گا اگر آپ اُن سے ثابت کر دکھائیں کہ خود سید صاحب مرحوم نے یہ کہاں لکھا ہے؟ اور کانفرنس کی تقریروں کے متعلق یہ فیصلہ امر و نہی کس نے قرار دیا ہے۔

بلا شبہ سر سید مرحوم اس کے بانی تھے لیکن بانی ہونے سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ مسئلہ تعلیم کو انھوں نے ایک خاص اصول کے ماتحت کر کے کانفرنس کے حوالے کر دیا ہے۔ اور اب اس کے پلیٹ فارم پر اس کے ایک حرف سے بھی انحراف و اختلاف جائز نہیں؟

قرآن حکیم سے ہمارے مجتہدین و فقہا مسائل کا استخراج کیا کرتے ہیں۔ اس استخراج و استنباط کی انھوں نے متعدد قسمیں قرار دی ہیں۔ ایک یہ کہ صاف صاف کسی آیت میں کوئی حکم ہو اس کو "صراحتہ النص" کہیں گے۔ ایک یہ کہ صاف صاف حکم نہ ہو لیکن اور طریق بیان سے دلالت ہوتی ہو یا اشارہ کیا گیا ہو، تو اس کے لیے "دلالتہ النص" اور "اشارۃ النص" وغیرہ اصطلاحات قائم ہیں۔

کی نقل تلاش کیجیے جو انھوں نے جسٹس موصوف سے کرایا تھا۔

پہلی لکھنؤ کانفرنس میں تو خود سرسید مرحوم نے مرحوم سجاد حسین ایڈیٹر اودھ پنچ سے یہ مقدمہ طے نہ کیا، حالانکہ بڑی ضرورت اس مقدمے کی اس وقت تھی معلوم نہیں آپ کو وہ واقعات معلوم ہیں یا نہیں۔ معاف فرمائیے گا۔ آپ نے یہ ایک اصولی سوال چھیڑ دیا ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ آل انڈیا کانفرنس جس کو تمام مسلمانوں کی نیابت دی جاتی ہے، اپنے پلیٹ فارم کے لیے ایک خاص مذہب رکھتی ہے اور جو اس کے خلاف رائے رکھتا ہو، اسے وہاں قدم رکھنے کا حق نہیں۔ یہ کانفرنس کا ایک خطرناک انفعال ہے اور ضروری ہے کہ ایک بار اس مسئلہ کو پبلک کے سامنے ٹھیک ٹھیک فیصل کرایا جائے آج تک کسی کو بھی اس کا خیال نہیں ہوا تھا۔

۲۔ بہر حال یہ تو آپ کا مقدمہ ہے۔ اپنی اصلی حقیقت تو یہ بھی صحیح نہیں کہ میں نے راولپنڈی کانفرنس میں کانفرنس کے مقاصد کو سامنے رکھ کر اس کا رد کیا تھا۔ بلکہ اس کا مقصد عام طور پر مسئلہ دعوۃ و اصلاح کا بحث تھا۔ اور یہ دکھلانا مقصود تھا کہ مسلمانوں کی ہر دعوۃ کو اصولاً

رسالہ حقوقِ نسواں کو پھاڑ کر ردی کی نوکری میں ڈال دیا تھا لیکن آپ کے پیشواؤں نے مسٹر طیب جی کو صدر بنایا اور انھوں نے پردہ کی علانیہ مخالفت پریذیڈنشل ایڈریس میں کی۔

پھر دوسری دہلی کانفرنس کی صدارت کے لیے سر آغا خاں لائے گئے۔ انھوں نے مسلمانوں کے تنزل کے جو اسباب اساسی بتلائے اُن میں عورتوں کا پردہ بھی تھا۔ کیا یہ سر سید کے عقاید کے خلاف نہ تھا۔

اس پونا کانفرنس کا صدر آپ نے جسٹس عبدالرحیم کو بنایا ہے جو سر سید کے بہت سے بنیادی اصولوں ہی کے مخالف ہیں۔ کیا ان سے بھی آپ نے یہ منظر مطے کرالیا ہے؟ آپ کو معلوم ہے کہ وہ ایڈریس میں کیا کہیں گے؟ آپ کو معلوم نہیں مگر مجھے معلوم ہے۔

مدراس کانفرنس کا صدر ایک مسیحی عہدہ دار جسٹس آدم تھا۔ اس مقدمہ کا اثر زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ سر سید مرحوم کے مذہبی تعلیم سے انحراف نہ ہو۔ لیکن ایک مسیحی شخص کے متعلق تو یہ سوال بھی پیدا ہو سکتا تھا کہ کہیں وہ نفسِ اسلام کے خلاف کوئی بات نہ کہہ دے۔ آپ تو اس وقت اس جگہ پر نہ تھے لیکن مرحوم محسن الملک کے کاغذات میں اس اقرار کا

رکھتے ہیں۔ اور اسلام کی دینی تعلیمات اور مسلمانوں کے ذہنی خصائص و مقومات کے علم صحیح کا اس پر اضافہ کر کے حقیقت شناسی کی طرف قدم اٹھا سکتا ہے۔ میرے گذشتہ ۳۰ سال کے لیل و نہار، سفر و حضر، صحت و مرض ہر حال کے مطالعہ دائمی کا ایک خاص موضوع یہ چیز بھی رہی ہے آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ مختصر رسائل و اخبارات و مجلات، عالم اسلامی کے سوا، خاص اسی موضوع پر کم از کم پچاس کتابیں میری نظر سے گذری ہیں جن کے وجود کا بھی خبرداران ہند کو علم نہیں پھر اس کے ساتھ الحمد للہ میں نے اس بارے میں ایک مجتہدانہ بصیرت پائی ہے اور اسلامی تاریخ کے استقرائی نتائج نے میری مدد کی ہے۔ اور قرآن و سنت نے مجھے دلائل و براہین کے ساتھ بتلایا ہے کہ اسی مسئلہ کی صحیح راہ اور سبیل رشاد کیا ہے

واللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم۔

لیکن! اس بارے میں میرا تخاطب آپ حضرات سے نہیں ہے اور نہ ہی اس بارے میں آپ حضرات سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ یہ موضوع دوسرا ہے۔ اور اس کی کائنات اس دنیا سے بالکل مختلف ہے جس میں آپ لوگ بستے ہیں۔ موجودہ مسئلہ سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ اور یہ بالکل

مذہبی ہونا چاہیئے اور اس کے واسطے سے تعلیم کی پھیلانی چاہیئے۔ یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ مذہب سے الگ ہو کر ایک مستقل تعلیمی دعوت قرار دی جائے جس میں کبھی کامیابی نہیں ہو سکتی۔

نیز یہ کہ اسلام میں "تعلیم" کی کوئی علیحدہ دعوۃ نہیں ہے۔ اس کی دعوۃ ایک ہی ہے اور اسی کے اندر سب کچھ موجود ہے۔

لیکن معاف فرمایئے گا یہ جو کچھ کیا گیا، اس کو آپ حضرات بالکل نہیں سمجھ سکتے۔ بلکہ قدیم وجدید جماعتوں میں آج کوئی گروہ ایسا موجود نہیں ہے جو اس حقیقت کا صحیح اندازہ شناس اور محرم وخبردار ہو۔ گذشتہ صدی کے تمام مسائل اصلاح و دعوۃ میں سے آپ حضرات کو صرف سرسید مرحوم ہی کی تحریک کا حال معلوم ہے اور اس کے استغراق سے مہلت نہیں۔ آپ کو کیا معلوم کہ مسئلہ "تحریک جدید" و "دعوۃ تعلیم جدید" (متعلق اہل اسلام) خود ایک موضوع مستقل ہو گیا ہے اور گذشتہ صدی کے اندر تمام عالم اسلامی نے اس پر نظر ڈالی ہے۔ اور ایک وسیع لٹریچر اس کا موجود ہے۔ اس کے دیکھنے سے ایک شخص ان تمام مشارب ومذاہب وطرق واسالیب کو معلوم کر سکتا ہے جو اس مسئلہ سے تعلق

(۴) سردست اس مسئلہ کو یوں صاف کیا جاسکتا ہے کہ آپ مجھ سے شخصاً دریافت کریں کہ آئندہ کانفرنس میں کس موضوع پر تقریر کروں گا؟ پھر اس سے اندازہ کرلیں کہ یہ تقریر کیسی ہوگی؟

میں نے پہلے آپ کو لکھا تھا۔ اب بالتشریح لکھتا ہوں کہ میری تقریر کا موضوع "صراط مستقیم" ہوگا۔ اس کی تشریح، اور وہ بیانات جو قرآن حکیم نے صراطِ مستقیم کے متعلق کیے ہیں۔ اس موضوع کے کسی حصہ کو نہ تو سرسید کے تعلیمی مشن سے کوئی تعلق ہے اور نہ کچھ اس کی بحث ہے۔ یہ ایک خالص مذہبی موضوع ہے اور از سرتا پا قرآن وسنت کے متعلق۔

(۵) الحمد للہ کہ خدا نے ہندوستان کے ہر گوشے کو میری آواز کی پذیرائی کے لیے آمادہ کر دیا ہے اور ہر جگہ ہزارہا دل پیدا کر دیتے ہیں جو میری ہر آواز کے استقبال کے لیے مستعد ہیں۔ وا ما بنعمۃ ربک فحدث کوئی روک جو آپ حضرات اس کے لیے پیدا کریں سود مند نہیں ہوسکتی اور گیند کی قوت جذب کا فعل جس قوت سے ہوتا ہے۔ اتنی ہی طاقت سے قوت دفع جواب بھی دیتی ہے۔ راولپنڈی میں آپ لوگوں نے میری مخالفت کر کے پبلک کو اپنے سے بدظن کرایا۔ پھر اس کے نتائج لازمی ہیں۔ علی الخصوص یونا کو تو میں

بے سود تھا کہ آپ نے اپنی خواہش کو کانفرنس کے ایک اصول کی شکل میں پیش کر دیا۔

آپ لوگوں کا دعویٰ ہے کہ آپ سر سید مرحوم کے مشن کے داعی ہیں۔ سر سید کا بڑا کارنامہ یہ بتلایا جاتا ہے کہ انھوں نے تقلید کا قلع قمع کیا اور اجتہاد رائے کا دروازہ کھولنا چاہا۔ لیکن آپ لوگ خود ہی ایک بدترین تقلید اعمی میں گرفتار ہو گیے ہیں۔ اور یہ تقلید اُسی تقلید سے ہزار درجہ افسوس ناک ہے جو مقلدین فقہ ہدایہ یا مقلدین تفسیر جلالین کی بیان کی جاتی ہے۔ تاہم میں اس بارے میں کچھ نہ کہوں گا۔ کیونکہ کہنا بیکار ہے "تقلید" کا پہلا خاصہ یہ ہے کہ سوال کا جواب نہیں مل سکتا۔ ولکن لا حیوۃ لمن تنادی۔

(۳)۔ بہر حال آپ نے میرے شخص خاص کے معاملے کو کانفرنس کا اصولی مسئلہ بنا کر ایک اہم بحث چھیڑ دی ہے جس کو اگر صاف نہ کیا گیا تو کانفرنس کے دروازوں پر مسلمانوں کے لیے قفل چڑھا دیئے جائیں گے۔ اس کا صاف کرنا تو اب ناگزیر ہو گیا ہے۔ لیکن ان دو چار دنوں کے اندر آپ کے لیے کچھ ضروری نہیں ہے کہ ایک شخصی معاملے کو کسی اصول موضوعہ کے حوالے کر کے الگ ہو جائیں

کانپور کا دردناک نظارہ

زمین پیاسی ہے۔ اُس کو خون چاہیئے لیکن کس کا؟ مسلمانوں کا، طرابلس کی زمین کس کے خون سے سیراب ہے؟ مسلمانوں کے، مغرب اقصیٰ کس کے خون سے رنگین ہے؟ مسلمانوں کے، ایران پر کس کی لاشیں تڑپتی ہیں؟ مسلمانوں کی، سرزمین بلقان میں کس کا خون بہتا ہے؟ مسلمانوں کا۔ ہندوستان کی زمین بھی پیاسی ہے، خون چاہتی ہے، کس کا مسلمانوں کا، آخرکار سرزمین کانپور پر خون برسا۔ اور ہندوستان کی خاک سیراب ہوئی۔

ہندوستان کی دیوی جوش و تحرکش میں ہے۔ اپنی قربان گاہ کے لیے نذر مانگتی ہے، کون ہے ہمت کا جوان جو اس کی خواہش پوری کرے۔ صوبہ متحدہ کا بادشاہ (سر جیمس مسٹن) بالآخر بادشاہ کے آگے بڑھا اور اُس نے اپنی وفادار رعایا (مسلمانوں) کا خون پیش کیا جو اپنی جان کے بدلے اس کو سب

آپ سے زیادہ جانتا ہوں۔ کانفرنس کا پنڈال آپ مجھ پر بند کر کے دیکھ لیں، میں کسی اور گوشے میں خدا اور اُس کے رسول کا پیام مسلمانوں کو پہنچا سکتا ہوں، میرا ذاتی نقصان اس سے کچھ نہ ہوگا، اور اگر کوئی شخص اس حماقت میں گرفتار ہے کہ کانفرنس کا پلیٹ فارم میرے لیے ایک بہت ہی بڑی عجیب و غریب دولت ہے جس سے محروم ہو کر لُٹ جاؤں گا تو اس کی حماقت بہت ہی افسوس ناک ہے۔ اگر آپ لوگ سمجھتے ہیں کہ کانفرنس میں میری تقدیر روک کر کوئی بڑی کامیابی حاصل کر سکتے ہیں تو بسم اللہ اس کا بھی تجربہ ہو جائے۔ جب کہ چار پانچ سال سے بیسیوں تجربے آپ لوگ کر چکے ہیں۔ مجھے اللہ اور اس کے رسول کی ان تعلیمات کو کہنا، لکھنا، مدون کرنا ہے، جن کو میری بصیرت حق سمجھتی ہے اور میرا معاملہ اب وہاں تک پہنچ گیا ہے کہ اب لوگوں کے یہ ارادے اس کے لیے بالکل خارج از بحث ہیں۔ مولوی نذیر احمد مرحوم کا ترجمۃ القرآن آپ کے پاس شاید ہوگا۔ اس میں سورۃ جن کو نکالئے اور کسی وقت فرصت ملے تو اس آیت پر غور کیجئے۔ وانہ لما قام عبد اللہ یدعوہ کادوا یکونون علیہ

تھے۔ انھیں کیا خبر تھی کہ یہ گولیاں اُن ناتواں انسانوں کے سینوں کو توڑ توڑ کر برطانی عدل و انصاف کو زخمی کر رہی ہیں؟ انھیں کیا معلوم تھا کہ اس گولی کا نشانہ اس ستون کو کمزور کر رہا ہے جس پر حکومت برطانیہ کی عمارت قائم ہے؟ وہ مسرور رہیں کہ ہم وفاداری کی خدمت ادا کرتے ہیں، نادانو! تم اس سے عداوت کر رہے ہو جس کی محبت کا اظہار چاہتے ہو۔

وہ کیا عجیب منظر تھا جب کربلائے کانپور میں کئی ہزار بے دست وپا برطانی رعایا برہنہ سر، برہنہ پا، با چشم پرنم و بادل پرغم ایک سیاہ علم کے نیچے جو اسلام کی مظلومی و بےکسی کا نشان تھا، کئی سو معصوم بچّوں کے ساتھ، چند اینٹوں اور پتھروں کا ڈھیر لگا رہی تھی اور اُسی کی زبان پر وہ دعا جاری تھی جو وقت تعمیر کعبہ ابراہیم و اسمٰعیل کی زبان پر جاری تھی۔

یہ پراثر مقدس نظارہ ختم نہیں ہوا تھا کہ مسٹر ٹائلر (مجسٹریٹ کانپور) کی سپہ سالاری میں مختصر سوار اور پیدل فوج تمام اسلحہ سے مسلح نمودار ہو جاتی ہے۔ اور دس منٹ تک اپنی بندوقوں سے اُڑا اُڑا کر گولیوں کی ایک چادر ہوا میں پھیلا دیتی ہے۔ پردہ جب چاک ہو جاتا ہے، میدان میں خاک و خون میں تڑپتی ہوئی لاشیں نظر آتی ہیں، جن میں بعض معصوم جانیں

سے زیادہ عزیز اور محبوب تھی۔

مسلم تمنی تو اب کہاں لیتے گی؟ کہ تیرے لیے ہندوستان بھی امن کا گھر نہیں رہا، وہ جس کو تو سب سے بڑی اسلامی سلطنت کہتی تھی، وہ بھی تیرا خون مانگتی ہے۔ لیکن دشمنی سے نہیں محبت سے۔ وہ تیری محبت اور وفاداری کا امتحان لیتی ہے۔

ہمالیہ تو دنیا کا سب سے بڑا پہاڑ ہے، تو تند و تیز ہوا کو روک دیتا ہے، تو غیض و غضب کے بادل ٹھکرا کر پیچھے ہٹا دیتا ہے۔ کیا تو ہمارے شداید و مصائب کا طوفان نہیں روک سکتا، کیا تو ہمارے حزن و غم کے بادل کو ٹھکرا کر پیچھے نہیں ہٹا سکتا۔

برٹش حکومت کہتی ہے کہ رعایا کے مذہب کا احترام ہوگا۔ لیکن کیا وہ احترام اُس سے بھی کم ہوگا جتنا ایک سڑک کے سیدھے ہونے کا۔ برٹش حکومت کہتی ہے کہ رعایا کے خون کا احترام ہوگا لیکن کیا اُس سے بھی کم، جتنا ایک راستے کی زینت و آرائش کا۔

۳ اگست کی صبح انقلاب حکومت برطانیہ کی تاریخ ہے۔ بہادر سپاہی جس وقت ایک ضعیف و ناتواں و غیر مسلح مجمع پر گولی برسا رہے

عدالت کے کمرے اور قید خانوں کی کوٹھریاں تھیں ہتھکڑیاں نہیں کی نوکیں اور بندوقوں کی گولیاں نہ تھیں۔ برٹش مورخ ہم کو بتا سکتا ہے کہ برسٹل اور مانچسٹر کے کتنے ہنگاموں میں آتشبار ہتھیاروں سے کام لیا گیا ہے؟ ہم جانتے ہیں کہ وہ ہم کو حوالہ دے گا کہ برسٹل اور کانپور میں کتنی مساوات ہے؟ لیکن اے معصوم مؤرخ! برائے خدا ہمیں بتا تاکہ برسٹل اور کانپور کی ذی روح حقیقتوں میں کتنا فصل ہے؟

نصرانی کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا اعتقاد ہے کہ عورتوں میں روح نہیں، لیکن اے مقدس نصرانی! پیغمبر ناصرہ کے لیے بتا کیا تیرا یہ اعتقاد ہے کہ مسلمانوں میں روح نہیں۔ ہاں روح ہے لیکن تو نے ان کو بے جان کر دیا۔ کیا تجھ کو شریعت کا یہ حکم یاد نہ رہا کہ تو "خون مت کر"

مسٹر جیمس مسٹن کی سرکاری اطلاع کہتی ہے کہ "معاملۂ انہدام مسجد کے لیے مسلمانان کانپور میں کوئی جوش نہیں صرف بیرونی مسلمانوں کو جوش ہے" واقعہ قتل عام سے پہلے بھی یہ غلط تھا کہ اگر یہ سچ تھا، تو مسلح سپاہی وقت انہدام مسجد کیوں گھیرے تھے؟ سنگینوں اور بندوقوں کے ہیبت ناک نظاروں سے کن کن کو ڈرایا جا رہا تھا؟ اور اب تو حکومت صوبہ متحدہ کو

ٹلی ہیں۔ جو افسوس دم توڑ چکیں۔

گورنمنٹ پریس کا فرشتۂ غیب ہم کو اطلاع دیتا ہے کہ میدان میں ۴۲ لاشیں تھیں، پھر بتاتا ہے ۱۸ انھیں عقیدت مند دل اس کو تسلیم کرتا ہے لیکن عقل و حجت طلب کو کیوں کر سمجھائیں کہ ایک تنگ میدان میں ۱۰، ۱۵ ہزار آدمیوں کا مجمع ہے۔ پولیس بے محابا دس منٹ تک بے پروائی سے اُن پر گولیاں برساتی ہے۔ ہر ایک گولی ایک دو گز کے فاصلے تک پھیلتی ہے اور صرف ۱۸ لاشیں اُن کے صدمے سے گر پڑتی ہیں مسلمان اپنی روئیں تنی کا دعویٰ کرتے ہیں، اُن کو مسرور ہونا چاہیئے کہ گورنمنٹ پریس بھی اُن کے اس اعجاز کو تسلیم کرتا ہے۔

حکومت قانون کے ماتحت ہے لیکن افسوس ہم زبان کے ماتحت ہیں، ہم پر گورنمنٹ کا قانون حکومت نہیں کرتا۔ ہم پر حکام کی زبان حکومت کرتی ہے ایک ضعیف و کمزور مجمع جس کے ہاتھ میں کوئی آلہ ضرر نہیں، جو کسی انسان کا محترم خون نہیں گراتا، جو کسی جائداد و عزت پر حملہ نہیں کرتا، صرف ایک جنبش لب سے آغشتہ بخاک و خون ہو جاتا ہے۔

بے شبہ وہ قانون کی مخالفت کرتا تھا، لیکن اس کی تادیب کے لیے

سر جیمس مسٹن اب کیا چاہتے ہیں؟ کیا دعوائے سابق کے یقین کے لیے کسی اور دلیل کے طالب ہیں۔ اگر حقیقت میں اُن کی طلب صادق ہے اور اُن کی کوشش کامل ہے تو ہم بتاتے ہیں کہ ان آہنی زنجیروں میں بھی آگ ہے جو اسیران مدافعت ملی کے ہاتھوں اور گردنوں میں ہیں۔ انھیں خبردار رہنا چاہیئے کہ زنجیروں کی آہنی جسمانیت دوسری آہنی جسمانیت سے ٹکرا کر شعلہ نہ پیدا کرے۔

صوبہ متحدہ کا طرز حکومت اُسی وقت ایک خونیں منظر کا اشارہ کر رہا تھا جب اُس کا فرمانروا ایک طرف اسٹریچی ہال (علی گڑھ) میں اور دوسری طرف مقامی دربار (گورکھپور) میں ایک سپیکر کی حیثیت سے نمودار ہوا تھا۔ اُس نے دھمکی دی تھی کہ "بزور اس جوش کو فرو کروں گا" آخر ۳ / اگست کو اُس وقت جب کہ وہ بریلی میں تھا اور ایک مسلمان ریاست (رام پور) اُس کا خیر مقدم کر رہی تھی اُسی نے بزور اس جوش کو فرو کر دیا۔

ہمیں اس کا خوف نہیں کہ مسلمان ایک مسجد کے اعادۂ حرمت کی کوشش میں مقتول و مجروح ہوئے کہ یہ اُن کی خصوصیت ملی ہے

خود نظر آرہا ہوگا کہ لوازم تدبر و سیاست سے اُس کا خزینۂ حکومت کس قدر تہی تھا۔

سر جیمیس مسٹن کی سرکاری اطلاع کی شہادت ہے کہ مسلمانان کانپور کا جوش جرائد اسلامیہ کی برافروختگی اور طعن و تشنیع و ملامت کا نتیجہ ہے لیکن وہ کون تھا جس نے مسلمانوں کو کہا تھا کہ اُن کی غیرت و حمیت کا جولانگاہ صرف قلم کا میدان ہے؟ شہنشاہی انگلستان کی نیم سرکاری زبان ٹائمز۔

سر جیمیس مسٹن نے قصداً مسلمانوں کو چھیڑا اور اُن کے اس جوش دینی اور ولولۂ اسلامی کو جھوٹا کہا جو ۱۳۰۰ برس سے جھوٹا نہ ہوا تھا اُنھوں نے اُن زیر خاک انگاروں کو راکھ کا ڈھیر سمجھا جو تیرہ سو برس سے اسی طرح روشن رہے بس جیمیس مسٹن کے یقین کے لیے دلیل چاہیئے تھی۔ فرزندانِ اسلام بڑھے اور انھوں نے مقتل عام میں جا کر جسمانی پردہ جو فرمانروائے صوبہ کے سامنے حائل تھا اُلٹ دیا اور دنیا کو نظر آگیا کہ درحقیقت اس پردہ کے پیچھے سُرخ انگارے تھے جو خود دوسرں کو نہ پھونک سکے پر خود کو پھونک دیا۔

دین توحید کی ایک سرد لاش تھی۔ انھوں نے اپنے گرم خون کے چھینٹے دیئے کہ ان بیجان لاشوں میں حرکت پید   حرکت پیدا ہوئی اور اُس نے تمام ہندوستان کو لرزا دیا۔

ہندوستان لرزتا ہے، کون ہے جو اس کو تھامے؟ ہندوستان مضطرب ہے کون ہے جو اُس کو تسکین دے؟ ہندوستان وقف فریاد ہے کون ہے جو اس کی فریاد رسی کو آمادہ ہو؟

مقتولین کانپور! تم پر نماز نہیں پڑھی گئی کہ تم مغفور تھے، ہم گنہگار تمہاری مغفرت کی کیا دعا مانگتے؟ لیکن سنا ہے کہ تم کو کفن نہ ملا، گولیوں اور بندوقوں کے قطع و برید کے بعد تمہارے جسم اسپتال کی قینچیوں اور چھریوں کے کام آئیں گے، غزوہ بنی لحیان میں شہدائے اسلام کی لاشیں فرشتوں نے اٹھالی تھیں، ہم آج یقین رکھتے ہیں کہ اخفائے راز کے لیے اگر پولیس نے تمہاری لاشیں دریا میں نہیں پھینکیں اور زمین میں نہیں دفن کیں، تو یقیناً تمہاری لاشوں کو فرشتوں نے اٹھالیا کہ رضوان الٰہی ان کا منتظر تھا

مجروحین کانپور! تم نے گولیاں کھائیں ہیں نیزوں سے تمہارے سینوں میں سوراخ کیا گیا ہے؟ تمہاری آنکھوں میں سنگینیں بھونکی گئی

ایک ہزار تین سو برس ہوئے کہ مسجد خلیل کی لقا نے حرمت کے بیے سربکف ہیں، لیکن اس کا خوف ہے کہ حکومت متحدہ جن غیر قانونی گولیوں سے اپنی وفادار رعایا کو مجروح کر رہی تھی اُس سے وہ خود تو مجروح نہیں ہوگئی ؟۔

شہدائے کانپور کی یاد ہمارے دل میں ہر وقت تازہ رہے گی۔ ہم اُن کی برسی منائیں گے ہم اُن کا مرثیہ پڑھیں گے ہم اُن کی مظلومی وبیکسی کو ہر وقت یاد رکھیں گے، ہم اُن کے جوش حمایت دینی ومدافعت ملی کو روئیں گے ہم آئندہ سے ۳ راگست کی صبح کو ۱۰ محرم کی دوپہر سمجھیں گے کہ یہ ہماری مظلومیت کی پہلی قسط تھی ۔

۴ راگست کی صبح کو ہز آنر لفٹیننٹ گورنر صوبہ متحدہ اسپشل ٹرین سے کانپور پہنچ کر قتل گاہ تشریف لائے۔ جہاں انھوں نے دیکھا ہوگا کہ صرف انسانی ضد اور غلط کاری نے جو گورنمنٹ کے منشاء و قانونی کے بالکل غیر مطابق تھی، اُسی دیوار کے نیچے جہاں چند روز پہلے تیشوں نے ایک معبد اسلام کی بے حرمتی کی تھی، پرستارانِ دینِ حنیف ایک ایک اینٹ کو اپنے خون کا سرخ کفن پہنا رہے تھے کہ اُس کی ہر اینٹ

تھے کہ ہمارے پاس اُن کے تحفہ کے لیے جو سامان تھا، اُس میں خون کے قطرے نہ تھے۔ اب ہم شرمندہ نہیں، اے مسلمانانِ عالم! ہمارے بہے ہوئے خون، کٹی ہوئی رگوں اور تڑپتی ہوئی لاشوں کا ہدیہ قبول کرو۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ہیں؟ تمہارے ایک ایک عضو کو زخموں سے چور کیا گیا ہے؟ تمہیں یاد ہوگا کہ فرات کے کنارے بھی اسلام کا ایک قافلہ اسی طرح لٹا تھا۔ جس کے بعد بنو امیہ کی تاریخ کا ورق الٹ گیا۔

معصوم بچو! اور ریاض اسلام کے نو دمیدہ غنچو! تمہیں کس نے مرجھا دیا؟ سرزمین مشرق کے الفاظ طعن نے تمہیں بے گناہ و ناآشنائے جرم دلوں کو مضطرب کر دیا، تم بڑھے کہ اپنے دہن زخم سے اس الزام کی تکذیب کرو، اے طائران قدس! اڑ جاؤ کہ عرش کی سبز قندیلیں تمہاری منتظر ہیں۔

اخبارات کے سیاہ حرفوں میں ہمارے لیے تنبیہہ و عبرت نہ تھی قدرت نے خون کی سرخ تحریر دل میں ہمیں نامۂ عبرت و دستور تنبیہہ بھیجی۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے اس کو پڑھا اور اس سے تنبیہہ و عبرت حاصل کی۔

کانپور کا واقعہ کانپور کا نہیں رہا، بلکہ وہ دنیائے اسلام کا واقعہ ہے۔ مسلمانانِ عالم نے ہر گوشہ سے ہمارے پاس اپنے مصائب و آلام کی آغشتہ خون اطلاعات کا ہدیہ بھیجا تھا۔ ہم شرمند

کی پھیلائی ہوئی موت اور برسائی ہوئی ہلاکت کی گواہی کہ ارضِ الٰہی کا امن ڈوب گیا۔ انسانیت کی بستی اجاڑ ہوگئی۔ نیکی کا گھر لوٹ لیا گیا اور دنیا مثل اُس بیوہ کے ہوگئی جس کا شوہر زبردستی قتل کر دیا گیا ہو اور اس کے یتیم بچوں پر رحم نہ کیا گیا ہو۔ اب وہ اپنے کیئے ہوئے سنگار پر ماتم کرے گی اور اپنی پھٹی ہوئی چادر کو سر سے اتار دے گی۔ کیونکہ اس کا حسن زخمی ہوگیا، کیونکہ اس کا شباب پامال کر دیا گیا اور اس لیے کہ اس کے فرزندوں نے اُس پر تلوار اٹھائی اور اس لیے کہ اس کے دوستوں نے اسے کچل دیا۔ پس زندگی کی جگہ موت، عیش و سلامتی کی جگہ اضطراب، نغمۂ نشاط کی جگہ شورِ ماتم، زمزمہ سنجی کی جگہ نوحہ خوانی، آب زندگی کی جگہ بحرِ خونیں، بستیوں کی جگہ قبریں، اور زندگی کے کاروبار اور بازاروں کی چہل پہل کی جگہ موت کے وہ جنگل جن میں لاشیں سڑیں گی اور ہولناک سمندروں کے وہ خونی طوفان جن میں انسان کی لاشیں مچھلیاں بن کر اچھلیں گی۔ اور اے دنیا کے بڑے بڑے مغرور شہروں کے بسنے والو! کل تک تمہاری ماؤں نے تمہیں جنا تھا تا زندگی پر گھمنڈ اور طاقت پر مغرور رہو۔ پر آج موت کے کھلونے ہو جنہیں بگاڑ دیا جائے گا اور ہلاکت کی مورتیں ہو جنہیں مٹا دیا

قتل وغارت کا ہولناک منظر

(جنگ عظیم)

موت اور ہلاکت کے وہ اوقات المیہ جو خون کی رگوں اور گوشت کے ریشوں کے اندر سے انسان کی جانوں کو کھینچ لیتے ہیں اور آبادیاں اجاڑ اور زندگیاں ہلاک ہو جاتی ہیں۔ وہ ارواح حرب وقتال جو زندگی کے لیے موت کا اور آبادی کے لیے ویرانے کا دروازہ ایسی عجلت اور ایسی آسانی سے کھول دیتی ہے گویا کسی لیٹے ہوئے بند کو کھول دیا گیا۔ وہ ہلاکت اور موت کی عظیم الشان ہستیاں جن پر انسان پاش توپیں لدی ہوئی ہیں اور آگ اور خون کے خونخوار درندے سوار ہیں اور جو سمندروں میں تیرتی پھرتی ہیں اور ایک دوسرے سے بازی لے جانا چاہتی ہیں تا اپنے شئون امور کی تدبیر کریں۔ اب سب کی جہانی ہیبت اور پھیلی ہوئی وحشت کی قسم، اور ان سب

اشرف المخلوقات کی صورت سے آدمی مگر خواہشوں میں کہ بھیڑیا محل سراؤں میں متمدن انسان مگر میدانوں میں جنگلی درندہ، اور اپنے ہاتھ پاؤں سے اشرف المخلوقات، مگر اپنی روح میں دنیا کا سب سے زیادہ خونخوار جانور ہے۔ اب اپنی خونریزی کی انتہائی شکل اور اپنی مردم خوری کے سب سے زیادہ برے وقت میں آگیا ہے۔ وہ کل تک اپنی کتابوں کے گھروں اور علم و تہذیب کے دارالعلوموں میں انسان تھا، پر آج چیتے کی کھال اُس کے چمڑے کی نرمی سے زیادہ حسین اور بھیڑیئے کے پنجے اُس کے دندانِ تبسم سے زیادہ نیک ہیں، درندوں کے بھٹ اور سانپوں کے جنگلوں میں امن و راحت ملے گی مگر اب انسانوں کی بستیاں اور اولادِ آدم کی آبادیاں راحت کی سانس اور امن کے تنفس سے خالی ہوگئی ہیں۔ کیونکہ وہ جو خدا کی زمین پر سب سے اچھا اور سب سے بڑھ کر تھا۔ اگر سب سے برا اور سب سے کمتر ہو جائے تو جس طرح اس سے زیادہ کوئی اور نیک نہ تھا، ویسا ہی اس سے بڑھ کر اور کوئی برا بھی نہیں ہو سکتا۔

شیر خونخوار ہے مگر غیروں کے لیے۔ سانپ زہریلا ہے مگر دوسروں

جائے گا۔ اور پھر اسے وہ کہ تمدن کی بہشت، علم کے مرغزار اور عیش و نشاط زندگی کے جبرت آباد اور عجوبہ راز تھے، تم کل تک دوسروں کی موت و ہلاکت کی خبریں سنتے تھے، پر آج تمہاری ہلاکت کی خبریں پڑھی جائیں گی۔ کل تک تمہارے پاس کرۂ ارضی کی مصیبتوں کا قلم تھا، پر آج تمہاری مصیبتوں کی تاریخیں مدون ہوں گی تم کل تک دوسروں پر ظلم و قہر کرتے تھے پر آج تم پر ظلم کیا جائے گا۔ تم کل تک دوسروں کے لیے آگ سلگاتے تھے، پر آج تمہارے لیے جہنم بھڑک رہی ہے تم کل تک ضعیفوں اور ناتوانوں کے لیے درندے تھے، پر آج درندوں میں خود چل گئی اور بھیڑیوں نے آپس میں ایک دوسرے پر پنجہ مارا تم کل تک دنیا کے لیے موت کی بجلی اور ہلاکت کی بدلی تھے، پر آج کوئی نہیں جو تمہیں ہلاکت کی بارش اور بربادی کے رعد و برق سے بچا سکے۔ کل مشرق کی بربادیوں کا تم نے تماشا دیکھا، آج وہ تمہاری ہلاکت کو دیکھ رہا ہے۔

ماتم انسانیت

انسان کی سوئی ہوئی سبعیت و بہیمیت پھر جاگ اٹھی ہے وہ

نوعِ انسانی کو عالمگیر نقصان و ہلاکت سے بچا سکتے ہیں؟ کیا فانوسِ کشش ثقل جس پر نئے علم کو ناز ہے اس سے بچا لے گا؟ کیا قوتِ برقی کا کشف اسے رد کرے گا؟ کیا بھاپ اور اسٹیم کی ایجاد کچھ سفارش کر سکے گی، اور انسان کو غمگینی سے بچا لے گی؟ آہ یہ ایجاداتِ محیرہ یہ مخترعاتِ مدہشہ یہ محدثاتِ منورہ جس پر مدنیت کو ناز اور علم کو غرّہ ہے، امن و سلامتی کی جگہ خود ہی ہلاکت اور بربادی کا وسیلہ اور خون اور آگ کی افزائش و تضاعف کا ذریعہ ہیں۔ اگر پہلے دنیا کے لیے صرف کمان کا تیر اور تلوار کی دھار تھی تو آج تمدن کی بدولت ایک سیکنڈ میں کئی کئی مرتبہ چھوٹنے والے ہلاکت بار گولے اور محلوں اور قلعوں کے اندر شہروں اور قلعوں کو مسمار کر دینے والے آہن پوش جہاز ہیں۔ پھر اے علم و مدنیت کے شیطان کیا تو اس لیے آیا تھا کہ خدا کی آبادی کی ویرانی کو دوگنا اور اس کی ہلاکت کے آلات کو زیادہ مہلک اور لاعلاج بنا دے؟ اور اے انسان کی غفلت اور اے اولادِ آدم کی نادانی! تو کب تک خدا سے لڑے گی اور کب تک اس کی زمین کے امن و راحت کو رد کرے گی؟ حالانکہ تمدن اور علم تجھے توپ بنا سکتا ہے۔ پر نیک نہیں بنا سکتا؟

کے لیے، چیتا درندہ ہے مگر اپنے سے کمزر جانوروں کے لیے لیکن انسان دنیا کا اعلیٰ ترین مخلوق، خود اپنے ہی ہم جنسوں کا خون بہانا اور اپنے ہی ابنائے نوع کے لیے درندۂ خونخوار ہے۔

پھر اس سے بڑھ کر خسران ونقصان کیا ہوگا جس میں آج دنیا مبتلا ہے وہ دنیا جس نے قوتوں کی صیقل کی، جس نے فطرت کے قوانین مستورہ کو بے نقاب کیا، جس نے عقل وادراک کے خزانے کھلوا دئے۔ جس نے ارتقائے فکر وعلوئے مدرکہ سے دنیا کو علم کا گھر اور دریافتوں اور تحقیقوں کی مملکت بنا دیا۔ جو علم ومدنیت کے انتہائے عروج سے متوالی ہوگئی جو قوتوں کے حصول کے نشہ سے بدمست ہو کر مغرورانہ جھومنے لگی جس نے کہا کہ انسان کے سوا کچھ نہیں۔ اور جس نے اعلان کیا کہ مادہ کے اوپر کوئی نہیں۔ کیا آج اس کا یہ علم اعلیٰ یہ مدنیت عظمیٰ، یہ ایجادوں کا ڈھیر، یہ مخترعات کا انبار، یہ بے شمار کتابوں کی جلدیں اور یہ لاتعداد ولاتحصی دماغوں کے افکار عالیہ ومدنیہ، ایک لمحہ، ایک دقیقہ کے لیے بھی اس ہولناک بربادی، اس خوفناک تصادم، اس وحشت انگیز خونخواری، اس خون کا سمندر بہانے والی اور لاشوں سے جنگلوں کو بھر دینے والی جنگ کو روک سکتے ہیں اور

نہائے اور اژدہوں نے پھنکاریں ماریں مگر نہ تو ایسی درندگی آج تک کسی میں تھی جیسی موجودہ متمدن اقوام کی قوتوں کو حاصل ہے اور نہ اب تک ایسا سانپ اور اژدہا پیدا ہوا جیسے کہ ان لڑنے والوں میں سے ہر فریق کے پاس ڈسنے، نگلنے اور چیرنے پھاڑنے کے لیے عجیب عجیب ہتھیار جمع ہیں۔ اس اژدہے کو دیکھو جو جنوب سے منہ کھولے بڑھ رہا ہے۔ اس ہاتھی کو دیکھو جس کی سونڈ غرور و طاقت سے جھوم رہی ہے، اور جس کے دانت ہلاکت کے دو نیزوں کی طرح نکلے ہوئے ہیں۔ اس بھیڑیئے کو دیکھو جو مشرقی یورپ کے [illegible] سے چیختا ہوا اُٹھا ہے، اور اس خوفناک چیتے کو دیکھو جو لامارک اور روس کی سرزمین میں خون اور گوشت کے لیے پلا ہے! یہ کیسے مہیب ہیں؟ یہ کیسے خوفناک آلات سے مسلح ہیں؟ ان سب کا باہم ایک دوسرے پر گرنا اور چیرنا پھاڑنا کرہ ارض کا کیسا خوفناک بھونچال ہوگا؟ ایسا بھونچال جو کبھی نہیں آیا، ایسا طوفان جو کبھی بھی نہیں اٹھا، ایسی آتش فشانی جو کبھی نہ ہوئی اور خداوند کا ایسا غصہ جو اب تک کبھی بھی زمین پر نہ آیا۔

متمدن قوموں کا غرور حد تک پہنچ چکا ہے۔ ان قوموں اور عجیب عجیب

رستخیز تصادم

اور دیکھو یہ کیسی آگ ہے جو بھڑک اٹھی ہے اور کس طرح تمدن کی حسین و جمیل آبادیاں آگ اور دھوئیں کی ہولناکی کے اندر ویران ہو رہی ہیں یہ دنیا کی مغرور اور فتحمند طاقتوں کی ٹکر ہے، اور اتنی بڑی انسانی درندوں کی لڑائی جتنے بڑے خونخوار اسباع و بہائم آج تک کرۂ ارض پر پیدا نہیں ہوتے۔ دنیا نے سیتھس کے قصے سنے ہیں جس نے یروشلم کو تباہ کر دیا۔ دنیا نے بخت نصر کو دیکھا جو بنی اسرائیل کو گرفتار کر کے بابل لے گیا، دنیا میں ایرانیوں کے قہر و استیلا کے افسانے سنے گیے ہیں، جنہوں نے بابل کو مسمار کر دیا تھا اور رومیوں کے عہد تسلط و عروج کے ایسے بہت سے فاتح خونریزوں کی روایتیں محفوظ رکھی گئی ہیں جنہوں نے خدا کی پیدا کی ہوئی مخلوقوں کو بہت ستایا اور اس کی سرزمین پر بہت فساد کیا۔

لیکن خون بہانے کی ایسی شیطانی قوتیں، آگ برسانے کے ایسے جہنمی آلے، اور موت و ہلاکت پھیلانے کی ایسی اشد شدید ابلیسیت تو کسی کو بھی نصیب نہ ہوئی۔ زمین کی لعنت پر ہمیشہ درندوں نے بھیٹ

سکتے تھے، جو آج سب سے چھوٹے ہو گئے ہیں اُن کے جہازوں کے مقابلے کے لیے اُن کے جہازوں سے بڑھ کر جہاز چاہئے تھے، مگر وہ کہاں تھے؟ ان کی توپوں کے لیے اُن کی توپوں سے زیادہ ہلاکت بار توپیں درکار نہیں؟ مگر وہ کہاں ڈھلتیں؟

پس جب زمین پر اُن سے بڑھ کر اور کوئی نہ تھا جس کے اندر سے خدا کا ہاتھ ہوتا تو دیکھو کہ حکمت الٰہی نے کس طرح خود انہی کو مسلط کر دیا اور اس کی یہ تدبیر کی کہ باہمی جنگ و قتال میں مبتلا ہو گئے۔ اب ان کا ہولناک تمدن جس کو ایک ہزار سال کے اندر اُنھوں نے تیار کیا تھا، انھیں کی تخریب میں کام آیا، اور اُن کی ہر ترقی اور ہر بڑائی خود انہی کے لیے وسیلہ تخریب ہو گئی۔ اگر ان کو توپوں سے بڑھ کر دوسروں کے پاس توپیں نہ تھیں، تو انھی کی توپوں کے گولے اُن کے لیے اڑنے لگے، اگر ان سے بڑھ کر جنگی جہاز دوسروں کے پاس نہ تھے تو وہی جہاز ان کے مقابلے کے لیے سمندر میں تیرنے لگے، ہر پتھر جو اُنھوں نے اٹھایا، خود انھی کے لیے اڑا، اور ہر آلہ جو انھوں نے تیار کیا، خود اُنھی کے لیے متحرک ہوا۔ انھوں نے بڑا سامان کیا تھا مگر خدا کا سامان سب سے بڑا ہے:

ترقیوں نے انھیں متوالا کر دیا ہے۔ اُن کو حسبِ سُنن الٰہیہ زمین کی حفاظت کا منصب دیا گیا۔ لیکن اُنھوں نے قوت پا کر جنگ و فساد کی راہ اختیار کی اور طغیان و عصیان سے ارضِ الٰہی کو بھر دیا۔

پس ضرور تھا کہ غرور و طغیان کے لیے کوئی حد ہوتی۔ عجب نہیں کہ مہلت ختم ہو گئی ہو، اور اچنبھا نہیں اگر ارضِ الٰہی کے امن کے لیے، بندگانِ خدا کی راحت کے لیے، اور کمزوروں کو سکھ کی نیند سلانے کے لیے اُن کا خون انہی کے ہاتھوں بہایا، اور اسی طرح عدالتِ الٰہی ان قوتوں کا حساب لے جو صدیوں سے تمام دنیا کے اعمال کا حساب لے رہے ہیں۔

یورپ کا تمدن، اُسی کی طاقت، اسی کا جنگی اقتدار، اس کے عجیب عجیب اسلحہ اور برباد کن ہولناکیاں، اس کے مہیب جہاز اور کئی کروڑ تک پہنچ جانے والی متحدہ فوج، ایسی قاہر و جابر تھی کہ ان کی تنبیہہ کے لیے خود انہی کے سوا اور نہیں ہو سکتا تھا۔ انھوں نے اپنے سوا ہر خوف کو پامال کیا، اور اپنے سوا اور کچھ رہنے نہ دیا، پس کون تھا جو اُن کے مقابلے میں نکلتا، اور دنیا میں کس کا ہاتھ اتنا قوی تھا جو اُن آہنی پنجوں پر پڑتا؟ جو کہ سب سے بڑے ہو گئے تھے، اُن کے لیے وہ لوگ کیا کام دے

دعوتِ عمل

آنکھیں دیکھنے کے لیے ہیں۔ کان سننے کے لیے اور دل پہلو میں رکھا گیا ہے تاکہ بیقرار ہو، لیکن وہ سب کچھ تمہارے لیے بیکار ہو گیا ہے جس کو آنکھ دیکھتی ہے اور وہ سب آوازیں بے اثر ہو گئی ہیں جو کانوں سے سنائی دیتی ہیں اور وہ تمام فکریں اور عبرتیں ڈوب گئی ہیں جن سے دل تڑپتا اور روحیں بیقرار ہوتی ہیں پس جو کچھ کیا جائے لا حاصل ہے اور جو کچھ کہا جائے بیکار ہے۔ آہ! تم غافل ہو گئے ہو، تم پر موت کا پنجہ چل گیا ہے، تم گمراہی کے قبضہ میں آ گئے۔ تمہارے احساس فنا ہو گئے اور تمہارے دل کی دانائی میٹ دی گئی، اگر ایسا نہ ہوتا تو جو کچھ ہو چکا ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ ایسا تھا کہ اندھے بینا ہو جاتے، لنگڑے چلنے لگتے، گونگوں کی چیخ سے دنیا ہل جاتی اور لولوں کے ہاتھ شمشیر زنوں کے بازوؤں کی طرح

انهم يكيدون كيدا یہ لوگ اپنا داؤ کر رہے تھے اور ہم اپنا داؤ
و اكيد كيدا فمهل کھیل رہے ہیں۔ بس منکروں کو مہلت
الكافرين امهلهم لینے دو زیادہ نہیں تھوڑی سی۔
رويدا (١٢:٥٦)

* * * * * * * * * *

لیے صرف ایک ہی راہِ نجات ہے اور بغیر اُس کے کسی طرح چھٹکارا نہیں
تم جب تک اس پہلی منزل سے نہ گذ‌رو گے اس وقت تک خدا کا قہر
تم پر سے ٹھنڈا نہ ہوگا۔ اور تم کبھی مراد اور خوشحال نہ پاؤ گے تمہارے سفر
عمل کا پہلا قدم یہ ہے کہ توبہ کرو، توبہ کرو، اپنی تمام قوتوں اور تمام طاقتوں
کے ساتھ خدا کے آگے جھک جاؤ، اُس کے آگے اس طرح گرو اور اس
طرح روؤ اور اس قدر تڑپو کہ اُسے تم پر پیار آ جائے اور وہ تمہیں پہلے کی
طرح پھر اپنی گود میں اٹھا لے، اور سب کچھ تمہیں کو دیدے جس طرح کہ
سب کچھ تمہیں کو اُس نے بخش دیا تھا۔

تم نے غفلت کو آزما لیا، تم نے نافرمانیوں کی صدیوں تک کڑواہٹ
چکھ لی تم نے گناہ اور معصیت کے پھل سے اچھی طرح اپنے دامن بھر
لیے، تم نے دیکھ لیا کہ ایک خدا کی چوکھٹ سے تم نے سرکشی کی اور کس
ساری دنیا تم سے سرکش ہو گئی اور ایک اُسی کے روٹھنے سے کس طرح
تمام دنیا تم سے روٹھ گئی۔ پس مان جاؤ اور اب بھی باز آ جاؤ۔ گناہوں کو
آزما چکے آؤ تقویٰ و راستبازی کو بھی آزمالیں۔ سرکشیوں کو چکھ چکے، آؤ
اطاعت کا بھی مزہ دیکھ لیں۔ غیروں سے رشتہ جوڑ کے تجربہ کر چکے، آؤ

طاقتور ہوجاتے، آہ! تمہاری غفلت سے بڑھ کر آج تک دنیا میں کوئی اچنبھے کی بات نہ ہوئی، اور تمہاری نیند کی سنگینی کے آگے پتھروں کے دل چھوٹ گیے، آہ تم ایسے نہ تھے۔

آہ! میں کیا کروں، اور کہاں جاؤں اور کس طرح تمہارے دلوں کے اندر اتر جاؤں، اور یہ کس طرح ہو کہ تمہاری روحیں پلٹ جائیں اور تمہاری غفلت مر جاتے۔ یہ کیا ہو گیا ہے کہ پاگلوں سے بھی بدتر ہو گئے ہو اور شراب کے متوالے تم سے زیادہ عقل مند ہیں، تم کیوں اپنے آپ کو ہلاک کر رہے ہو اور کیوں تمہاری عقلوں پر ایسا طاعون چھا گیا ہے کہ سب کچھ کہتے اور سمجھتے ہو پر نہ تو راستبازی کی راہ تمہارے آگے کھلتی ہے اور نہ گمراہیوں کے نقش قدم کو چھوڑتے ہو۔

پس میں آج سب کچھ چھوڑ کے تم سے ایک ہی آخری بات کہنی چاہتا ہوں اور یقین کرو کہ اس کے سوا جو کچھ کہا جاتا ہے اگر وہ اس بات کے لیے نہیں کہا جاتا تو سب کچھ بیکار ہے اور اس میں تمہارے لیے کوئی برکت و امن نہیں۔ سو یاد رکھو اور ماننے کے لیے جھک جاؤ کہ تمہاری زندگی کا ہر عمل بیکار ہے اور تمہاری فکروں کی ہر فکر گمراہی و ضلالت ہے۔ تمہارے

مایوسی کا پیام دے گا اور عزیز و اقربا دیکھ دیکھ کر ناامیدی سے روئیں گے اور کیا اُس وقت تمہیں خدا کو پکارنے اور ہر طرف سے مایوس ہو کر اسی سے راحت اور سکھ مانگنے کی ضرورت نہ ہوگی۔

اگر تم کو آنکھیں دی گئی تھیں تو اسی لیے تاکہ تم اس کو دیکھو، اگر تم کو دل دیا گیا تھا تو اسی لیے تاکہ صرف اسی کو پیار کرو۔ اگر تم کو آنسو دیئے گئے تھے تو اسی لیے تاکہ صرف اُسی کی یاد میں بہاؤ اور اگر تمہاری پیشانی بلند کی گئی تھی تو اسی لیے تاکہ اُسی کے آگے جھکاؤ۔ پر آہ تمہاری زبانیں اس کی حمد کے زمزموں سے محروم ہوگئیں، تمہارے دل اُس کی محبت کے نہ ہونے سے اجڑ گئے، تمہاری روحوں میں اُس کی چاہت کی جگہ غیر دل کی چاہتیں بھر گئیں۔ تمہارے قدم اُس کی طرف بڑھنے سے بوجھل ہو گئے اور تمہاری آنکھوں میں اُس کے عشق کے درد و غم کے لیے ایک قطرۂ اشک بھی نہ رہا۔ تمہاری مسجدیں تڑپ رہی ہیں کہ راستبازوں کی تڑپتی ہوئی اور مضطرب نمازیں اُن کو نصیب ہوں۔ مگر حیوانوں اور چارپایوں کے کھڑے رہنے اور اوندھے ہو جانے کے سوا وہاں کچھ نہیں ہوتا حالانکہ تمہارا خدا تمہارے کھڑے رہنے اور اوندھے گر پڑنے کا بھوکا نہیں، اور

اُسی ایک سے پھر کیوں نہ جڑ جائیں جس سے کٹ کر ذلتوں اور خواریوں، ٹھوکروں اور ر اندگیوں کے سوا کچھ بھی ہات نہ آیا۔

تمہارے خدا نے تمہارے ساتھ کونسی برائی کی تھی کہ تم نے اُسے چھوڑ دیا، اور اُسے چھوڑ کے کونسی دولت و نعمت ہے جو تمہیں ہات آگئی خدا سے بڑھ کر وہ کون حسین ہے جس کے حسن نے تم کو خدا سے چھین لیا، اور اُس سے بڑھ کر کس کے پاس محبت اور پیار ہے جس کی زنجیریں تمہارے پاؤں میں پڑ گئیں؟ تم غیروں کے پاس جاتے ہو تاکہ ٹھوکریں کھاؤ، پر خدا کے پاس نہیں دوڑتے تاکہ وہ تمہیں پیار کرے۔ اگر تم محبت کے بھوکے ہو تو الرحمن الرحیم سے بڑھ کر اور کون ہے جس کے عشق میں اُسے چھوڑ رہے ہو؟ اگر تم رزق کے بھوکے ہو تو رب العالمین سے بڑھ کر اور کون ہے جس کے خزانوں کے لالچ نے تم کو متوالا کر دیا ہے؟ اگر تم اپنی محنت کی مزدوری مانگتے ہو تو مالک یوم الدین سے بڑھ کر کون مل گیا ہے جو تمہیں بدلہ دے گا؟ آہ، ثم آہ۔

پھر کیا تم بالکل اُسی سے بے نیاز ہو گیے اور اب تمہیں خدا کے آگے جھکنے کی کوئی ضرورت نہیں رہی؟ کیا تم کبھی بیمار نہ پڑو گے جب کہ طبیب

متحرک کر دے گا کنکروں اور خاک کے ذرّوں کے اندر سے صدائیں اُٹھنے لگیں گی۔ پر وہ فاسق اور نافرمان انسانوں سے کبھی بھی کلام نہ کرے گا اور اپنے کلام پاک کی عزت کو ناپاکیوں کی گندگی سے کبھی بھی آلودہ نہ ہونے دے گا۔ اور پھر تم مانو یا نہ مانو مگر میں نے سچ مچ دیکھا کہ جب تمہارے اندر سے اُس کی پکار کا جواب نہ ملا تو وہ دوسروں کو پیار اور محبت کے ہاتھوں سے اشارہ کر رہا ہے۔

٭٭٭٭٭٭٭

اگر پاؤں پر کھڑا رہنا ہی عبادت ہوتا ہے تو جنگلوں کے درختوں سے زیادہ تم کھڑے نہیں رہ سکتے۔

بہت ہو چکا۔ اب بھی چھوڑ دو، آہ، بہت سو چکے اب بھی چونک اُٹھو۔ بہت گم ہو چکے اب بھی اپنے آپ کو پالو۔ خدا نے تم کو وہ مہلت دی ہے جس سے بڑھ کر آج تک زمین کی کسی مخلوق کو بھی مہلت نہ دی گئی۔ پھر ایسا نہ ہو کہ وہ تم سے اپنا رشتہ کاٹ لے اور تمہاری جگہ کسی اور کو اپنی چاہتوں کی شہنشاہی اور اپنی محبت کا تاج و تخت دے دے جیسا کہ اُسی نے ہمیشہ کیا ہے۔

اگر تم کو اپنا مال و متاع خدا سے زیادہ محبوب ہے کہ اُسے نہ دو گے اور اپنی جانوں کو اُس کی محبت سے زیادہ پیارا سمجھتے ہو کہ اُس کے لیے دکھ میں نہ ڈالو گے، اور اگر تمہارے دلوں کی آہیں، تمہارے جگر کی ٹیسیں، اور تمہاری آنکھوں کے آنسو، اب اُس کے لیے نہیں رہے بلکہ دوسروں کا مال ہو گئے ہیں، تو یقین کرو کہ وہ بھی تمہارا محتاج نہیں ہے، اور اس کی کائنات انسانوں سے بھری پڑی ہے۔ وہ اگر چاہے گا تو اپنے کلمۂ حق کی خدمت کے لیے درختوں کو چلا دے گا، پہاڑوں کو

نہ شام و فلسطین کی حکومت اُن کو خوش کر سکی، نہ وسط ایشیا کی، بلکہ تمام
مشرق سے بے پرواہو کر یورپ کی طرف بڑھے۔ اس کے عین قلب
(قسطنطنیہ) کو مسخر کر لیا، اور اُس کی اندرونی آبادیوں تک میں سمندر
کی موجوں کی طرح در آئے۔ حتیٰ کہ دارالحکومت آسٹریا کی دیواریں اُن کے
جولانیٔ قدم کی ترکتازیوں سے بارہا گرتے گرتے بچ گئیں۔ ترکوں کا یہ
وہ جرم ہے جو یورپ کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ مسلمانوں کا کوئی موجودہ حکمراں
خاندان اُس جرم (فتح یورپ) میں ان کا شریک نہیں ہے۔ اس لیے ہر
حکمران مسلمان اچھا تھا جو یورپ کی طرف متوجہ نہ ہو سکا۔ مگر ہر ترک وحشی
و خونخوار ہے۔ اس لیے کہ یورپ کا طلسم سطوت اُس کی شمشیر بے پناہ
سے ٹوٹ گیا۔ ترکوں نے پانچ صدیوں تک جس آزادی و فیاضی کے
ساتھ حکومت کی ہے۔ اس کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے کہ
چار صدیوں کی متصل حکمرانی کے بعد بھی محکوم عیسائیوں کی مذہبی و قومی
عصبیت ویسی ہی زندہ و توانا رہی جیسی کسی متعصب سے متعصب مسیحی
حکومت کے ماتحت رہ سکتی تھی۔ حتیٰ کہ وہ ترکوں کی کمزوری کے ساتھ
ہی آزاد و خود مختار ہو گئے اور آج ایک حریف و مقابل کی طرح لڑ

تُرک اور یورپ

ہم کو معلوم ہے کہ مسلمانوں کی تمام حکمراں جماعتوں میں ترکوں ہی کی جماعت وہ بدقسمت جماعت ہے جس کے لیے کوئی یورپین دماغ منصف نہیں ہو سکتا۔ یورپ کا پچھلا مورخ ہو، خواہ موجودہ عہد کا مدبر وہ گزشتہ عہد کے بدتر سے بدتر مسلمانوں کی مدح و توصیف کر سکتا ہے جواب موجود نہیں ہیں لیکن ترکوں کی نہیں کر سکتا جن کی تلواریں پانچ صدیوں سے یورپ کے دل و جگر میں پیوست ہونے کے لیے چمکتی رہی ہیں۔ وہ خلافت بنو اُمیہ کی ایک بہتر تاریخ لکھ سکتا ہے عباسیہ کے دورِ علم و تمدن کی مدحت سرائی کر سکتا ہے۔ صلاح الدین ایوبی تک کو ایک بُت کی طرح پوج لے سکتا ہے لیکن وہ اُن ترکوں کے لیے کیونکر انصاف کر سکتا ہے جو نہ تو عرب پر قانع ہوئے نہ ایران و عراق پر

درندے کو جس طرح پھاڑا، اور ہر سفید بھیڑیئے نے دوسرے سفید بھیڑیئے پر جس طرح پنجہ مارا، نہ صرف ترکوں کی تاریخ میں بلکہ تمام ایشیا کی خونریزیوں کی مجموعی تاریخ میں اُس کی کوئی مثال نہیں مل سکتی ہے۔ بایں ہمہ ترک خونخوار اور وحشی ہیں، اور یورپ تہذیب و تمدن اور امن و رحم کا پیغمبر ہے! علی الخصوص برطانیہ کے مقدس جزیرہ میں تو جس قدر فرشتے بستے ہیں، وہ صرف انسانی آزادی کی حفاظت اور چھوٹی قوموں کی حمایت ہی کے لیے آسمان سے اتارے گئے ہیں!

یہ کرۂ ارض کی تاریخ میں حق و باطل کا سب سے بڑا مقابلہ ہے۔ آج اُس کی فتح و شکست کا اصلی فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ زمین فوجوں کے بوجھ سے دبی ہوئی ہے، فضا ہوائی جہازوں کی قطاروں سے بھری ہوئی۔ اس کا فیصلہ کل ہوگا، جب خدا کا دائمی قانون نتائج و عواقب کی زبان میں حقیقت کا اعلان کرے گا۔ اور مورخ کا قلم لکھے گا کہ یہ طاقت اور گھمنڈ کا سب سے بڑا چیلنج تھا جو سچائی کو دیا جا سکتا ہے۔ تاہم سچائی ہی سب سے بڑی طاقت ہے اور بالآخر فیصلہ اسی کا فیصلہ ہے۔

رہے ہیں۔ ہندوستان میں برٹش گورنمنٹ کے پورے تسلط کو ابھی پورے سو سال بھی نہیں ہوئے۔ اتنے ہی عرصہ کی حکومت نے قومی عظمت و عصبیت کے جذبات ان لوگوں کے دلوں سے بھی کھینچ لیے ہیں جن کے آبا و اجداد ساٹھ ستر برس پہلے اسی سرزمین میں حکمراں تھے۔ صرف یہی ایک یورپ کے طرزِ حکومت اور ترکوں کے طرزِ حکومت کا فرق واضح کر دینے کے لیے کافی ہے۔ ترکوں کے وہم و خیال میں بھی ظلم و خونخواری کی وہ ہیبت ناک صورتیں اور قومی تعصب و نفرت کی وہ وحشت ناک ہلاکیاں نہیں آسکتیں جو یورپ کے تمدن و تہذیب کا مغرور بت عین انیسویں اور بیسویں صدی کے سورج کی روشنی کے اندر کر چکا ہے۔ ان دو صدیوں کے اندر جنگل کے درندے آرام کی نیند سوئے اور سانپوں کو ان کی غاروں سے باہر نہیں نکالا گیا۔ لیکن ایشیا و افریقہ میں یورپ کے ہاتھوں زمین کا ایک ٹکڑا بھی ایسا نہ بچ سکا جس کو وہاں کی بدبخت مخلوق اپنی کہہ سکے اور جہاں ایک مالک و مختار کی طرح امن کی زندگی بسر کر سکے۔ خود اسی آخری جنگ میں یورپ کے ہر درندے نے دوسرے

کتابیں لکھنے میں ترکوں ہی کی تقلید سے یورپ میں رواج ہوا۔
یورپ کی زبانوں میں سب سے پہلی انسائیکلوپیڈیا دالامبرٹ
(VALAMBERT) نے لکھی لیکن اُس کو ایک ترک مصنف کلبی کی
قاموس العلوم ہی کے مطالعہ سے رہنمائی ملی تھی۔ کمسریٹ، ۔ طبی امدادی
اور فوجی شفا خانوں کا باقاعدہ انتظام ترکوں ہی سے یورپ نے
سیکھا۔ قلعہ کی تعمیرات میں تمام یورپ ترکوں کا شاگرد ہے۔ فوجی
باجا تمام یورپ نے ترکوں سے حاصل کیا۔ چیچک کے ٹیکہ کا اصلی
موجد ایک ترک تھا۔ یہ ڈریپر کریسی، گمنگرام، کلفرڈ وغیرہ مورخوں کی
تحقیق ہے جنہوں نے اپنے کتب خانوں میں بیٹھ کر ترکوں کے
اعمال پر نظر ڈالی تھی۔ قدرتی طور پر مسٹر اسکوئیتھ اور مسٹر لائیڈ جارج
کی رائے اس سے مختلف ہونی چاہیئے۔ جو ابھی ابھی گیلی پولی اور
عمارہ میں ترکوں کی تلوار کا کاری زخم کھا کر نکلے ہیں، اور کتب خانوں
کی جگہ نظارت خانوں کے اندر فیصلہ کرنے بیٹھے ہیں!

÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷

سنۃ اللہ فی الذین خلوا من قبل، ولن تجد
لسنۃ اللہ تبدیلا (۳۳: ۶۲)

آج ترکوں کی وحشت و تمدن کا فیصلہ علم و تحقیق کے ہاتھ میں نہیں ہے حریف حکومتوں کے اُن مغرور وزراء کے قبضہ میں ہے جو میدان جنگ سے واپس آکر اپنے ایک جنگی دشمن کی قسمت کا فیصلہ کرنے بیٹھے ہیں۔ پس امید نہیں کہ ڈریپر (DRAPER) جیسے زمانۂ حال کے مورخوں کی شہادت اسی بارے میں سنی جائے۔ یہ امریکن مصنف اپنی مشہور کتاب (HISTORY OF THE CONFLICT BRTUEE RELIGION AND SCIENCE) میں لکھتا ہے کہ انصاف و عدالت اور مذہبی بے تعصبی میں اپنے عہد کی تمام عیسائی دنیا پر ترکوں کو وہی فوقیت رہی ہے جو چھٹی صدی عیسوی میں عربوں کو متمدن بیزنطائن پر حاصل تھی۔ ایڈورڈ کریسی نے تاریخ روم میں ترکوں کو تہذیب و تمدن اور علمی ایجادات و اختراعات کے لحاظ سے پندرھویں اور سولھویں صدی کے تمام یورپ میں سب سے برتر قوم تسلیم کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسائیکلوپیڈیا کی قسم کی

وہ تمام درد و آہ و فغاں سوزاں یکجا کیا جا سکے جو ان تیرہ صدیوں کی لا تعداد و لا تحصی اسلامی نسلوں کی صدا ہائے ماتم کے ساتھ بلند ہوتا رہا ہے، اگر درد و کرب کی وہ تمام چیخیں، اضطراب، والم کی وہ تمام پکاریں، سوزش و تپش کی وہ تمام بیقراریاں، اکٹھی کی جا سکیں جو اسی حادثۂ کبریٰ کی یاد نے ہزاروں، لاکھوں اللہ والوں کے اندر ہمیشہ پیدا کی ہیں۔ تو اے عزیزانِ ماتم شعار! کون کہہ سکتا ہے کہ خونفشاں ہائے حسرت کا ایک نیا اشلانٹک وادقیانوس سطح ارضی پر بہہ نہ جائے گا؟ درد و فغاں کی ہزارہا بھٹیاں بھڑک نہ اٹھیں گی؟ اور درد و الم کی چیخوں حسرت کی صداؤں، تڑپ کی بے چینیوں کے ہنگامۂ خونیں سے تمام عالم ایک شہرزار نالہ و بکا نہ بن جائے گا؟

تاہم میں جو پیغام پہنچانے کے لیے آج آیا ہوں وہ اس تذکرہ سے بالکل مختلف ہے، میں غم والم کی شدت وکثرت کے اعتراف کی تاریخ نہیں ہوں بلکہ اس عدیم النظیر شدت وکثرت کے بعد بھی آنسوؤں کی طلب ہوں۔ آہوں کی صدا ہوں۔ اور آہ آہ! اے صد ہزار آہ و حرماں! کہ غم کے لیے بھوکا ہوں اور درد والم کے لیے یک قلم پیاسا ہوں پس

خطابۂ الم
(توحیدِ شہادت)

شمعہا بردہ ام از صدقِ تپاکِ شہدا
تا دل و دیدۂ خوں نابہ فشانم دادند

برادرانِ عزیز!

آج جس حادثۂ کبریٰ اور شہادتِ عظمیٰ کے تذکار و درس کے لیے ہم سب یہاں جمع ہوئے ہیں، وقائع و حوادثِ اسلامیہ کا وہ عظیم الشان واقعہ ہے جو تاریخِ اسلامی کی اولین صدی سے لے کر اس وقت تک اپنے عجیب و غریب تاثرِ ماتم و درد اور حیرت انگیز تفاعلِ ذکر و تاثیر کے لحاظ سے نہ صرف تاریخِ اسلام بلکہ تمام حوادث مخزنۂ عالم میں ایک عدیم النظیر امتیاز رکھتا ہے۔ اگر وہ تمام آنسو جمع کیے جائیں جو ۶۱ ہجری سے لے کر اس وقت تک اسی واقعۂ جاں سوز پر بہائے گئے ہیں اگر

والوں نے ماتم میں کمی نہ کی، آہ و نالہ کی صداؤں نے ہمیشہ ہنگامہ الم کی مجلس طرازیاں کیں۔ اور یہ سب کچھ اب تک اتنا ہو چکا ہے جتنا آج تک شاید ہی دنیا کے کسی حادثۂ غم کو نصیب ہوا ہو۔ تاہم تم یقین کرو کہ بایں ہمہ اس حادثۂ عظیمہ کی دعوۃ اشک و حسرت اب تک ختم نہیں ہوئی بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی دعوۃ درد کے اندر جو حقیقی طلب تھی۔ وہ اب تک لبیک کے سچے استقبال سے محروم ہے۔ تیرہ صدیاں مع اپنے دوران محرم و عشرہ ماتم کے اس پر گذر چکی ہیں لیکن اب تک خاک کربلا کے وہ ذرات خون آشام جن کو آج بھی اگر نچوڑا جائے تو خونِ شہادت کے مقدس قطرے اس سے ٹپک سکتے ہیں، بدستور آنسوؤں کے لیے پکار رہے ہیں، خوں فشانیوں کے لیے داعی ہیں، آہ و فغاں کے لیے تشنہ ہیں، اضطراب و التہاب کے لیے بیقرار ہیں! اور فضاء ریگ زار کرب و بلا کا ایک ایک گوشہ اب تک دیدہ ہائے اشک فشاں، جگرہائے سوختہ، دلہائے دو نیم اور زبان ہائے ماتم سرا کے لیے اسی طرح چشم براہ ہے جس طرح ۶۱ھ کی ایک آتش خیز دوپہر میں خون کی ندیوں کی روانی، تڑپتی ہوئی لاشوں

آج میں اُن آنکھوں کا تذکرہ نہیں کرنا جو بہت رو چکی ہیں۔ مجھے ان آنکھوں کا سراغ بتلاؤ جو اب بھی رونے کے لیے نم آلودہ ہیں! میں اُن دلوں کی سرگذشت نہیں سنانا جو تڑپتے تڑپتے تھک چکے ہیں۔ میں اُن دلوں کی تلاش میں نکلا ہوں جو اب بھی تہ و بالا ہونے کے لیے مضطرب ہیں! مجھے اُن زبانوں سے کیا سروکار جن کو فغاں سنجی نالے ماضی کا ادعا ہے؟ آہ میں تو اُن زبانوں کے لیے پکار رہا ہوں جن کے اندر غم و ماتم کی بھٹیاں سلگ رہی ہیں اور اُن کا دھواں آج بھی کائنات نشاط نادانی کی اس تمام فضائے غفلت کو مکدر کر دے سکتا ہے۔ جس کو عیش و عشرت کے قہقہوں میں درد و عبرت کی ایک آہ بھی نصیب نہیں۔

نہ داغ تازہ می خارد، نہ زخم کہنہ می کاوہ
بدہ یارب دلے، کیں صورت بے جاں نمی خواہم

دعوت درد

ہاں یہ سچ ہے کہ رونے والے اس پر بہت روئے، ماتم کرنے

سے کیوں آسمان کو سر پر نہیں اٹھا سکتی؟ اگر بے جان و بے روح پتھر دوسرے پتھر پر گر کر رعد و برق کا ہنگامہ پیدا کر دے سکتا ہے تو تم کہ روح و ارادہ رکھتے ہو، اپنے دست ہائے ماتم کناں سے کیوں ایک ہنگامہ نالہ و وحشت گرم نہیں کر سکتے؟ کیا تم کو دنیا کی اُن آنکھوں کی خبر نہیں جو روتی ہیں حالانکہ اُن سے ایک آنسو بھی نہیں بہا؟ کیا تم نے ان زبانوں کے متعلق کچھ نہیں سنا جو چیختی ہیں مگر انھوں نے ایک چیخ بھی نہ پائی؟ اور کیا تم نے اُن جسموں کا تماشا نہیں دیکھا جو تہ و بالا ہوتے ہیں حالانکہ اُن کو ایک تڑپ بھی نصیب نہ ہوئی؟ پھر کیا اسی غفلت آباد ہستی میں وہ دل بھی نہیں ہیں جو گو دل ہیں، مگر دل نہیں ہیں کیونکہ دل کی طرح نہیں سوچتے! کیا وہ کان بھی نہیں ہیں جو گو سامع ہیں مگر کان نہیں ہیں، کیونکہ نہیں سنتے؟ اور کیا ایسی آنکھیں بھی نہیں ہیں جو گو بصیر ہیں مگر آنکھیں نہیں ہیں کیونکہ نہیں دیکھتیں؟ لهم قلوب لا يفقهون بها، ولهم اذان لا يسمعون بها، ولهم اعين لا يبصرون بها، اولئك كالانعام بل هم اضل، واولئك هم الغافلون (۷: ۱۷۸)

کے ہنگامۂ احتضار، اور ظالم و مظلوم، اجرح و مجروح، قاتل و مقتول کے ہنگامۂ الم کے اندر سے نالہ ساز طلب اور فغاں فرمائے دعوۃ تھا!

شدیم خاک ولیکن بسوئے تربت ما
تواں شناخت کز یں خاک مردمی خیزد

لیکن اگر یہ دعوۃ درد محض اس پانی کے لیے جو ندیوں کی جگہ آنکھوں سے بہے، اگر یہ طلب غم محض اُن صداؤں کے لیے ہے جن کا غوغا درختوں کے جھنڈ، چڑیوں کے گھونسلوں، دریاؤں کے سیران کی جگہ انسانوں کی زبانوں سے بلند ہوا۔ اگر یہ انتظار الم محض اُس ماتم کے لیے ہے جو پتھروں کے ٹکرانے کی جگہ انسانی دست و سینہ کی ٹکر سے ہنگامہ ساز ہوا۔ تو اے برادرانِ غفلت شعار! وائے پشیمان خواب آلود! بلا شبہ یہ سب کچھ ہو چکا۔ اور بلا شبہ سوال کو جواب، دعوۃ کو لبیک اور طلب کو مطلوب مل چکا۔ اگر انسان کا بچہ بھوک سے رونا اور روٹی کے لیے آنکھوں کو سرخ کر لیتا ہے، تو انسان کے بڑے بڑے گروہ کیوں نہیں آنسو بہا سکتے؟ اگر درختوں کے جھنڈ ہوا سے ہل کر چند لمحوں کے لیے دنیا کو شور و غوغا سے لبریز کر دے سکتے ہیں تو آدم کی اولاد اپنے آہ و بکا

دلوں کے اندر حقیقت شناسی کی ایک ٹیس، عبرت کی ایک ٹپک، بصیرت کی ایک تڑپ احساس صحیح و حق کا ایک اضطراب بھی نہیں ہے؟

طوفان نوحؑ لانے سے اے چشم فائدہ؟
دو اشک بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں

اللہ اللہ سید الشہداء مظلوم کی مظلومی، اور یا للعجب غفلت و نادانی کی بوقلمونی! اس سے بڑھ کر دنیا میں "مظلومی" کی مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ دشمنوں اور دوستوں دونوں نے اس پر ظلم کیا۔ دشمنوں نے اس کی شہادت کی اصل حقیقت و بصیرت سے غفلت کی۔ دشمنوں نے اس پر ظلم کیا کیونکہ اس کی مظلومی پر انہیں رونا نہ آیا۔ پر ان دوستوں نے بھی ظلم کیا جو گو روئے، مگر اس کی اصلی تقدیس و شرف کے لیے سچائی اور عمل کا ایک آنسو بھی نہ بہا سکے۔ دشمن تو دشمن تھے اس لیے انہوں نے اس کی دعوۃ حق کو مٹانا چاہا، مگر دوست، دوست ہو کر بھی اس کی دعوۃ کی پیروی نہ کر سکے۔ وتراهم ينظرون اليك وهم لا يبصرون (۱۹۸:۷)

پس اے عزیزان من!

درد و الم کی وہ پاک دعوتیں صرف اس روانی آب، تسلسل صدا اور ہنگامہ غوغا ہی کے لیے نہیں ہوتیں جو آنسوؤں، فغانوں اور ماتموں کے نام سے ظہور میں آجائیں۔ اور اگر ان کا یہی مقصد ہوتا تو اس کے لیے انسان کی کوئی خصوصیت نہ تھی۔ کتنے ہی سمندر پانی سے بھرے ہوئے ہیں اور کتنے ہی جنگل شور و غوغا سے ہنگامہ زار ہیں۔ بلکہ یہ دعوۃ، یہ پکار، یہ طلب، یہ "ھل من مجیب" فی الحقیقت اُن آنسوؤں کے لیے ہے جو صرف آنکھوں ہی سے نہیں بلکہ دل سے بہیں۔ وہ اُن آہوں کا دھواں مانگتی ہے جن کی لپٹیں صرف منہ ہی سے نہیں بلکہ الحاق قلب سے اُٹھیں۔ وہ صرف ہاتھوں ہی کے ماتم کے لیے نہیں پکارتی بلکہ دل کے ماتم کی محض ایک صدائے حقیقت تشنہ ہے۔ اگر تمہارے پاس اُس کے لئے آنکھوں کا آنسو نہ ہو، تو اُسے کوئی شکایت نہیں، لیکن آہ تمہاری غفلت! اگر تمہارے پہلوؤں میں کوئی زخم نہ ہو جس سے پانی کی جگہ خون بہے! اگر تمہاری زبانوں کو درد کی چیخ نہیں آتی تو کوئی مضائقہ نہیں، لیکن آہ، یہ کیا ہے کہ تمہارے

راہ اخبار نویسی اور راہ دعوت و تبلیغ

بلا شبہ اگر تم نے اخبار نکالا ہے اور پریس قائم کیا ہے تو چاہیئے کہ سب کچھ اسی طرح کرو جس طرح اس راہ میں کیا جاتا ہے اور جس طرح کرنا چاہیئے۔ پھر تمہاری ہمت کے آگے ہندوستان کے اخبار نویس طبقہ کی قرار دادہ اصول عمل کی راہ بھی ہے۔ اور ترقی یافتہ ممالک کی حقیقی اخبار نویسی بھی۔ تم اپنے اندر اس اخلاقی اور تجارتی کیرکٹر کو بھی پیدا کر سکتے ہو جو اب تک ہندوستانی پریس نے پیش کیا ہے اور اسی تجارتی اولعزمی اور اقتصادی بلند ہمتی کے لیے بھی اپنے تئیں طیار کر سکتے ہو جو ترقی یافتہ ممالک کے پریسوں میں پائی جاتی ہے۔

تم چاہو تو "ہندوستانی اخبار نویسی" کی اس دکاندارانہ زندگی کو سیکھ سکتے ہو جو "دکانداری" کی قسم میں بھی سب سے ادنیٰ درجہ کی "دکانداری" ہے، اور جس کے لیے ضرور ہے کہ تم ایک ایک پیسہ کے لیے رو رو کر ایک

پس سچا ماتم وہی ہے جو صرف ہاتھوں ہی نہیں بلکہ دل کا ماتم ہو اور دعوۃ درد کا اصل جواب وہی ہے جو عبرت و بصیرت کی زبان سے نکلے تمہاری آنکھیں اس حادثہ پر بہت رو چکی ہیں مگر اب تک تمہارے دل کا رونا باقی ہے، اگر رونا ہے تو اپنے دل کو رلاؤ ورنہ صرف آنکھوں کی اس روانی کو لے کر کیا کیجئے جس میں دل کی اشک افشانی کا کوئی حصہ نہیں ہے حالانکہ انسان کی ساری کائنات حیات صرف دل ہی کی زندگی سے ہے۔ فانہا لا تعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور۔

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مرجائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

٧٨٧٨٧٨٧٨٧٨٧٨

اگر اس تقلید زار ہندمیں نئے ارادوں اور مجتہدانہ عزائم کا وجود ناممکن نہیں ہے تو اسی طرح دوسری راہ بھی تجارت اور دوکانداری کی مگر شریفانہ واولالعزمانہ تجارت کی تمہارے آگے باز ہے اور تم یورپ کے اخبار نویس لمنیفہ اور فن صحافت (اینجرنلزم) کے نمونوں کو اپنے سامنے رکھ سکتے ہو۔ اس لیے تمہارے لیے ایک عمدہ تجارتی کام مہیا ہو سکتا ہے جو قوم وملک کے لیے بھی مفید وضروری ہے اور تم ایک تاجر کی طرح خود بھی نفع اٹھا کر بہتر واحسن متاع اخوان ملت کو دے سکتے ہو۔ مگر اس کے لیے ضروری ہوگا کہ پہلے "ہندوستانی فن صحافت" کے اثرات وخبائث اور جراثیم سفاہت سے اپنے تئیں یک قلم صاف وپاک کر لو، اپنے اندر بلند نظری مگر ایک تاجر کی طرح بلند نظری پیدا کرو اور وسیع سرمائے اور تجارت کے عزائم صابرہ وتحملہ کے ساتھ سفر شروع کرو۔ اس میں تمہاری مثال ایک عقلمند وتجربہ کار کاشتکار کی سی ہوگی، جو قیمتی سے قیمتی بیج بھی نہایت فیاضی کے ساتھ زمین میں پھینک دیتا ہے اور ذرا بھی ہاتھ نہیں روکتا تاہم یہ اس کی بیدریغ بخششیں اس لیے نہیں ہوتی کہ وہ اپنا سرمایہ زمین کو بخشش دیتا ہے بلکہ اس لیے کہ آج ایک خشک دانہ دے

ایک دھیلے کے لیے ماتم کرو۔ ایک ایک کوڑی کے لیے اپنے دماغ وقلم کو بہتر سے بہتر قوت کو یکسر وقف کردو۔ شخصی محاسن وفضائل کا معیار صرف اپنے اخبار کی خریداری کو قرار دو، جو خریدے اُسے فرشتہ سمجھو۔ جو بدبخت نہ خریدے اُسے شیطان بتلاؤ۔ بلا طلب ہر خوش پوش کے نام اخبار جاری کردو اور سال کے آخیر میں وی پی بھیج دو۔ اگر اُس نے وی پی واپس کردیا تو ٹکٹ کے اُن پیسوں کو بھی اُس کے حساب میں داخل کردو جو واپسی کی وجہ سے ضائع ہوئے اور پھر جن جن وسائل کو عمل میں لاسکو اُس "شریفانہ بل" کی وصولی کے لیے اختیار کرو حتیٰ کہ وہ بدبخت اپنی زندگی سے عاجز آجائے اور اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لے کہ برِ اعظم ہند میں زندہ رہنے کی ضروری شرائط میں ایک بڑی شرط کسی "اخبار نویس" کے وی پی کو واپس نہ کرنا بھی ہے۔

غرضیکہ وہ مشکوک و منقوش وجود اعظم و اکرم جس کا ایمان شکن نام "پیسہ" ہے بہرحال حاصل کرنا چاہیے اور بہ حیثیت ایک "قومی اخبار نویس" ہونے کے اس کے حاصل کرنے کی ہر ممکن شکل تمہارے لیے جائز وحلال ہے۔

نے اپنا مذہب "عوض و بدل" کے عقیدے پر قائم کیا ہے اور "دعوۃ" کے مذہب کا پہلا عقیدہ ایثار و قربانی ہے۔ پھر کہاں "عوض" کی تلاش اور کہاں "قربانی" کی پکار؟ کہاں اس لیے دنیا کہ جو کچھ ہے لٹانے کے لیے ہے اور کہاں اس لیے خرچ کرنا کہ اگر مخارج نہ ہوں تو مداخل بھی پیدا نہیں ہو سکتے؟ کجا دستِ طلب کی جستجو اور کجا دستِ معطی و مشتری کے لیے بیقراری؟

فاین الثریا واین الثریٰ   واین معاویۃ من علی

کہاں نقد و متاع کی اس لیے فراہمی تاکہ خریدار پیدا ہوں اور کہاں اس لیے گرد آوری تاکہ کوئی غارت گر ملے؟

متاع جمع کن شاید کہ غارت گر شود پیدا

ایک "تاجر" اپنی تمام زندگی اور زندگی کی قوتوں کا مصرف صرف یہی سمجھتا ہے کہ کسی طرح اُس کے "شخص خاص" کو نفع پہنچے اور اگر اُس کا عمل و وجود دوسروں کے لیے سودمند بھی ہوتا ہے تو کسی رحم و احسان کی بنا پر نہیں، بلکہ اُسی جذبۂ نفع تجارت کی بنا پر۔ وہ ہمیشہ ایسے وقتوں کا انتظار کرتا ہے جن کے سامنے اُس کے نفع ذاتی کا کوئی پیام ہو۔

کہ کل کو اُس کے معاوضہ میں ایک ہزار تر و تازہ خوشے لینا چاہتا ہے

دعوۃ و تبلیغ

لیکن "دعوۃ و تبلیغ" کی راہ نہ صرف اخبار نویس کی راہ سے (کیونکہ یہ تو ایک شاخ ہے) بلکہ نفس تجارت اور اقتصاد و سود و زیاں کی راہ سے بالکل مختلف ہے اور اس عالم کے جس طرح موثرات دوسرے ہیں۔ اسی طرح احکام بھی دوسرے ہیں:۔

مرد ایں راہ را نشانے دیگر است

تجارت کی پہلی بنیاد مسئلہ "عوض و بدل" ہے یعنی جو کچھ دیا جائے اس سے بہتر اس کے معاوضے میں لیا جائے۔ اور دینا صرف اس لیے چاہیئے تاکہ اُس کے معاوضے میں لیا بھی جائے۔ لیکن یہی وہ اولین مقام ہے جہاں آکر "دعوۃ" اور "تجارت" میں محض اختلاف مسلک ہی نہیں بلکہ تباین و تضاد کلی پیدا ہو جاتا ہے اور دونوں حقیقتیں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتیں۔ راہ "دعوۃ" کی پہلی بنیاد وہ چیز ہے جو بالکل اُس کا عکس و تضاد ہے جو تجارت کے مذہب کا پہلا رکن تھا۔ تجارت

"نفع عام" ہے یعنی دوسروں کو فائدہ پہنچانا۔ اور جس قدر سچائی، جس قدر خلوص، جس درجہ اذعان و یقین کے ساتھ اس دعویٰ ایثار کو حاصل کرے گا اتنا ہی زیادہ "سچا" داعی ہوگا۔ تاجر اپنے بنیادی عقیدے کی بنا پر صرف انہی چیزوں کا طالب، رہتا ہے اور صرف انہی وقتوں، موسموں، مواقع اور مقامات کو ڈھونڈتا ہے جو اگرچہ دوسروں کے لیے ضرررساں ہوں پر اس کی تجارت کے لیے سودمند ہوں۔ ٹھیک ٹھیک اسی طرح ضرور ہے کہ داعی صرف انہی چیزوں کا طالب ہو اور صرف انہی وقتوں، موسموں مواقع اور مقامات وحالات سے عشق کرے جو خواہ خود اس کی ذات اور اس کی ذات کے حوال واطراف کے لیے کتنا ہی دکھ اور موت رکھتے ہوں لیکن دوسروں کے لیے ان میں راحت، سکھ اور زندگی ہو۔

من و دل گر فنا شدیم، چہ باک
غرض اندر میاں سلامت اوست

وہ ایسے مواقع و حوادث کو ڈھونڈتا رہتا ہے جن کا اثر تمام نوع انسانی اور پورا کرۂ ارضی کے لیے خواہ کتنا ہی مہلک و برباد کن ہو مگر اُس کی متاعِ تجارتی کے لیے مفید ثابت ہو۔

لیکن ایک "داعی" کے عقائد و اعمال اس کے بالکل ضد ہوتے ہیں۔ اِس کے اندر خواہ کتنی ہی خود غرضیاں چھپی ہوئی ہوں، نمائش و شہرت کے کیسے ہی جذبات تو بہ مخفی ہوں، وہ کتنا ہی سخت خود پرست اور کیسا ہی شدید نفس خواہ ہو لیکن اگر دعوۃ و تبلیغ کے اوقات کا ایک لمحہ بھی اس پر گزرا ہے تو وہ اپنے کام اور زندگی کے بقاء کے لیے مجبور ہے کہ نفع تجارتی کی پرستش گاہ سے یک قلم باہر آ جائے۔ اور اس کا نفس خواہ کتنا ہی ذات پرست ہو مگر اپنے اعمال کو بالکل اس سے متضاد و متباین کر دے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو بہ حیثیت داعی کے اس کا وجود باقی نہ رہے گا۔ وہ اپنے وجود عملی کی بقاء کے لیے مجبور ہے کہ مشرب تجارت کی یکسر تکفیر (انکار شدید) کر دے۔ تاجر کی تمام قوتوں کا مصرف "نفع خاص" تھا۔ وہ جس قدر زیادہ اس سبق کو یاد کرے گا، اتنا ہی زیادہ اچھا تاجر ہو گا۔ مگر داعی کی تمام قوتوں کا مصرف

وقتی جذبات و انفجار ہیجان کی مخلوق ہو۔ تم میں نہ امتیاز ہے نہ نظر۔ نہ تم جانتے ہو نہ پہچانتے ہو۔ تم جس قدر تیز دوڑ کر آتے ہو اتنی ہی تیزی کے ساتھ فرار بھی کر جاتے ہو۔ تمہاری اطاعت جس قدر سہل ہے اور تمہاری ارادت جتنی سستی، اتنا ہی تمہارا انحراف آسان ہے اور اُسی نسبت سے تمہاری مخالفت بھی ارزاں ہے پس نہ تو تمہاری تحسین کی کوئی قیمت، نہ تمہاری توہین کا کوئی وزن۔ نہ تمہارے پاس دماغ ہے نہ دِل۔ وساوس ہیں جن کو تم افکار سمجھتے ہو خطرات ہیں جن کو تم عزائم کہتے ہو۔ خدارا بتلاؤ! میں تمہارے ساتھ کیا کروں؟ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ آج جن باتوں کے لیے تم رو رہے ہو، یہ وہی باتیں ہیں جو ایک زمانے میں میری زبان سے فریاد کا اضطراب اور طلب کی چیخ بن کر نکلتی تھیں مگر تمہارے سینے کے اندر پتھر کا ایک ٹکڑا ہے اس سے ٹکرا ٹکرا کر واپس آجاتی تھیں۔ اور تم یک قلم انکار و اعراض میں غرق تھے؟

تم نے ہمیشہ اعراض کیا۔ تم نے اعراض ہی نہیں کیا۔ بلکہ جعلوا اصابعھم فی اذانھم، واستغشوا ثیابھم، واصروا،

موجودہ مسلمانوں کی حالت

عزیزانِ ملت! اس طول وطویل صحبت میں جو کچھ بیان کیا گیا اس میں کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے جو میری زبان پر نئی ہو۔ یہ تمام وہی افسانہ کہنہ ہے جو پچھلے دس سالوں سے دہراتا آرہا ہوں اور اگر "الہلال" و "البلاغ" کی پیہم صدائیں تمہارے حافظہ میں فراموش نہیں ہوگئی ہیں تو تم اس کی تصدیق کروگے تمہارے رہبروں اور پیشواؤں کی رائیں اور صدائیں کتنی ہی مضطرب ومتزلزل رہی ہوں لیکن میری طرف دیکھو! میں ایک انسان تم میں موجود ہوں جو دس سال سے صرف ایک ہی صدائے دعوت بلند کررہا اور صرف ایک ہی بات کی جانب تڑپ تڑپ کر بلا رہا اور لوٹ لوٹ کر پکار رہا ہوں۔ ولکن لا تحبون النّاصحین (۷ : ۲۸) افسوس! کہ تم حقیقی اور سچی بات کہنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔ تم نمائش کے پجاری، شورو ہنگامہ کے بندے اور

چاروں طرف اکٹھے کر دو کہ اُن کے ہجوم میں دو چار آدمیوں کا خون ہو جائے۔ مگر آہ! میں تمہاری ان بھیڑوں کو لے کر کیا کروں جب تمہارے دلوں میں سناٹا چھایا ہوا ہے، اور تمہارے اس جوش (ا) استقبال سے مجھے کیا خوشی ہو جب تمہاری روحیں موت کی افسردگی سے مرجھائی ہوئی ہیں۔ افسوس تم میں کوئی نہیں جو میری زبان سمجھتا ہو۔ تم میں کوئی نہیں جو میرا آشنا سا ہو۔ میں سچ سچ کہتا ہوں کہ تمہارے اس پورے ملک میں ایک بے یار و آشنا غریب الوطن ہوا۔

من بہ جمعیتے نالاں شدم،
جفت خوش حالاں و بدحالاں شدم
ہر کسے از ظن خود شد یار من،
وز درون من نہ جست اسرار من
سر من از نالہ من دور نیست
لیک کس را گوش آں منظور نیست

میری رایوں میں نہ کبھی تبدیلی ہوئی، نہ میرے سفر میں کبھی بیم و (ا) یسار کا تذبذب پیش آیا ہے۔ تبدیلیاں فکروں میں ہو سکتی ہیں،

واستکبروا استکبارا (۷۱ : ۷) کی ساری سنتیں غفلت و انکار کی نذر کر دیں۔ میں نے تم میں سے ہر گروہ کو ٹٹولا۔ میں نے دلوں اور روحوں کا ایک ایک گوشا چھان مارا۔ جب کبھی کوئی بھیڑ دیکھی فریاد کی۔ جب کبھی انسانوں کو دیکھا اپنی طرف بلایا۔ لکن فلم یزدھم دعائی الا فرارا (۷۱ : ۶) بہت کم روحیں ایسی نکلیں جن کو حقیقت کا فہم ہو، اور بہت کم دل ایسے ملے جو طلب و عشق سے معمور رہوں۔ یہاں تک کہ میں تمہاری آبادیوں سے الگ ہو کر رانچی کے گوشۂ قید و بند میں چلا گیا، اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہاں کبھی میری صبحیں اور میری شامیں کن فکروں اور کاموں میں بسر ہوتی رہیں۔ اب میں پھر تم میں واپس آگیا ہوں۔ لیکن تمہاری بھیڑوں اور غولوں میں سچی جستجو کا چہرہ اسی طرح مفقود ہے جیسا کہ ہمیشہ سے مفقود رہا ہے۔ اب تک حقیقت شناسی کی کوئی گہرائی تم میں نظر نہیں آتی۔ تم مجھے بلاتے ہو کہ استقبال سے بھرے ہوئے سٹیشنوں پر اتارو اور ایسے پرجوش انسانوں کے نعرے سناؤ جن کے ہاتھوں میں فتحمند فوجوں کی طرح جھنڈیاں ہوں۔ اور پھر اتنے انسان میری گاڑی کے

طرازیوں" کو اپنا اصل الاصول بناتے ہوئے ہو اور "قیام شریعت" اور "تقدیم واتباع شریعت" اور "حفظ دفاع ملت" کے ناموں سے موسوم کرتے ہو۔ پس جب کہ یہ پہلا تجربہ و مشاہدہ تمہارے سامنے ہے، تو آج میں اعلان کرتا ہوں کہ دوسرے تجربہ کا وقت آگیا۔ راہ عمل کے لیے تمہارا رُخ وہ ہے جس کی طرف تم دوڑ رہے ہو اور رہبری راہ وہ ہے جس کی طرف پچھلے صفحوں میں بلا چکا ہوں تم بارش کے وجود سے انکار تو نہیں کرتے، مگر منتظر رہتے ہو کہ پانی برسنے لگ جائے تو اقرار کریں لیکن میں ہواؤں میں پانی کی بُو سونگھ لینے کا عادی ہوں، اور صرف بادلوں ہی کو دیکھ لینا میرے علم کے لیے کافی ہوتا ہے پس اگر پچھلا تجربہ بس کرتا ہے تو اس سے عبرت پکڑو۔ اور اگر ابھی اور انتظار کرنا چاہتے ہو تو انتظار کر دیکھو:۔

فستذکرون ما اقول لکم، وافوض امری الی اللہ

ان اللہ بصیر بالعباد (۴۰ : ۴۷)

قیاسوں میں ہو سکتی ہیں، پولیٹیکل حکمت عملیوں میں ہو سکتی ہیں۔ انسانی تقلید اس کا سرچشمہ ہے اور انسانوں اور قوموں کا اتباع اس کا منبع لیکن اُن عقائد میں کچھ تبدیلی نہیں ہو سکتی جو وحی و تنزیل کی اٹل اور دائمی ہدایتوں سے ماخوذ ہیں۔ الحمد للہ کہ میں جو کچھ کہتا اور کرتا رہا وہ میرے عقائد و معلومات تھے۔ تمہارے بڑوں کی طرح آرا مظنونات نہ تھے وان الظن لا یغنی من الحق شیئا (۲:۵۴) اس وقت تم میں سے اکثروں نے اعراض کیا، بہتوں نے استہزا کیا، کتنوں ہی نے کہدیا کہ یہ تو ایک طرح کی مذہبی بناوٹ اور ما فوق الفطرت دعوؤں کا اعلان ہے: یرید ان یتفضل علینا۔ بعضوں نے تو فیصلہ ہی کر دیا کہ یہ صرف فصاحت و بلاغت کی ساحری اور ایک طرح کی ادیبانہ افسوں گری ہے۔ اکتتبها فهی تملی علیه بکرة واصیلا (۲:۲۵) لیکن دیکھو! بالآخر رفتہ رفتہ سب نے اپنی جگہیں چھوڑ دیں۔ سب اُسی راہ پر چل پڑے۔ بہتوں نے دانستہ، اور بہتوں نے نادانستہ مگر راہ سب نے وہی اختیار کی۔

آج تم سب اُسی ما فوق الفطرت دعووں اور ساحرانہ فصاحت

دنیا پرست کبھی ایک جا اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ کتوں کا مجمع ویسے تو
خاموش رہتا ہے لیکن ادھر قصائی نے ہڈی پھینکی اور ادھر اُن کے
پنجے تیز اور دانت زہر آلود ہو گیے یہی حال ان سگانِ دنیا کا ہے
ساری باتوں میں متفق ہو سکتے ہیں لیکن دنیا کی ہڈی جہاں سڑ رہی
ہو، وہاں پہنچ کر اپنے پنجوں اور دانتوں پر قابو نہیں رکھ سکتے۔ ان کا
سرمایۂ ناز علم حق نہیں ہے جو تفرقہ مٹاتا اور اتباعِ سبل متفرقہ کی
جگہ ایک ہی صراطِ مستقیم پر چلاتا ہے۔ بلکہ یکسر علمِ جدل و خلاف
ہے۔ نفس پرستی اُس کی کثافت کو خمیر دیتی اور دنیا طلبی کی آگ اُس
کی ناپاکی کے نجارات کو اور زیادہ تیز تر کرتی رہتی ہے۔ فساق و فجار
خرابات میں بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کا جام صحت پیتے ہیں
اور چور اور ڈاکو مل جل کر رہزنی کرتے ہیں۔ مگر یہ گروہ خدا کی مسجد اور
زہد و عبادت کے صومعہ۔ خانقاہ میں بیٹھ کر بھی متحد و یک دل نہیں
ہو سکتا۔ اور ہمیشہ ایک دوسرے کو درندوں کی طرح چیرتا پھاڑتا
اور پنجہ مارتا رہتا ہے۔ میکدوں میں محبت کے ترانے اور پیار و الفت
کی باتیں سننے میں آجاتی ہیں۔ مگر ہمیں محراب مسجد کے نیچے پیشوائی و

مذہب کی دُکان عُلمائے دُنیاپرست

مذہب کے دکانداروں نے جہل وتقلید اور تعصب وہواپرستی کا نام مذہب رکھا ہے، اور روشن خیال تحقیق جدید کے عقل فروشوں نے الحاد و بے قیدی کے حکمت واجتہاد کے لباس فریب سے سنوارا ہے۔ نہ مدرسہ میں علم ہے، نہ محراب مسجد میں اخلاص، اور نہ میکدے میں رندانِ بے ریا۔ ارباب صدق وصفا ان سب سے الگ ہیں اور سب سے پناہ مانگتے ہیں۔ ان کی راہ دوسری ہے۔

ہم کعبہ وہم بت کدہ سنگِ راہ ما بود
رفتیم وصنم بر سرِ محراب شکستیم

علمائے دنیاپرست

سانپ اور بچھو ایک سوراخ میں جمع ہوجائیں گے لیکن علماءُ

یورپ اور اسلام کی مساوات

یورپ کہتا ہے کہ مساوات وحریت کا وہ معلم ہے۔ ہم اس کو سچ مان لیتے ہیں لیکن پھر یہ کیا ہے جواب تک بادشاہوں کے سروں پر نظر آتا ہے، یہ کس کی دولت ہے جوتاج شاہی کے ہیروں میں دفن کی جاتی ہے۔

وہ سربفلک عمارتیں، وہ عظیم الشان محل وایوان، وہ انسانی ترقی کے بہتر سے بہتر وسائل تعیش اور ذرائع آرام وراحت جو آج بھی اس کے بادشاہوں اور پریذیڈنٹوں کے لیے لازمی سمجھے جاتے ہیں، کہاں سے آتے ہیں اور کن کا خون ہے جن کے قطروں سے عظمت وکبریائی کی یہ چادر رنگی جاتی ہے۔

اگر یورپ نے مساوات انسانی کا راز پالیا ہے تو اب تک بادشاہ ورعیت کے حقوق وامتیازات میں یہ فرق کیوں ہے؟

امارت کے لیے ان میں سے ہر ہاتھ دوسرے کی گردن پر بڑھتا اور خونخواری کی ہر آنکھ دوسرے بھائی کے خون پر لگی ہوتی ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے احبار و یہود سے فرمایا "تم نے داؤد کے گھر کو ڈاکوؤں کا بھٹ بنا دیا ہے" ڈاکوؤں کے بھٹ کا حال تو نہیں معلوم لیکن ہم نے مسجدوں کے صحن میں بھیڑیوں کو ایک دوسرے پر غرّاتے اور خون آشام دانت مارتے دیکھا ہے۔



ڈاکو اور سُود خوار

انسان کے اُن تمام بڑے بڑے جرائم جن کو اس کی خود غرضی کا دیو اس کے اندر سے انجام دیتا ہے، اپنے سامنے لاؤ اور پایہ ایک کر کے دیکھو! بڑے بڑے عادی مجرموں کو تم دیکھو گے کہ بار بار انسانی مظلومی اور بےکسی نے اُن کی آنکھوں کو اشک بار، اور اُن کے دلوں کو ودیم کر دیا ہے۔ سخت سے سخت بیرحم ڈاکو اور قاتل کی نسبت بھی تم سن سکتے ہو کہ اُس نے عین اپنی بے رحمی اور قساوت کے کسی عمل کو انجام دیتے وقت ایک بڑھیا عورت کی فریاد ایک بیکس عورت کی گریہ وزاری اور ایک یتیم بچے کی مضطربانہ فغان الغیاث پر اپنی کھینچی ہوئی تلوار پھینک دی اور چند لمحوں کے لیے اس کی بھولی ہوئی انسانیت یاد آگئی۔ تاریخ اور ملکی روایات نے ان ڈاکوؤں کے حالات قلمبند کیے ہیں جو ایک طرف تو دولت مندوں کو لوٹتے اور مال و دولت سے بھرے ہوئے

یورپ کی مساوات یہ ہے کہ بادشاہ کے ہاتھ سے مطلق العنانی کی باگ چھین لے۔ مگر اسلام صرف اتنے ہی کو کافی نہیں سمجھتا بلکہ وہ اُن کے سروں پر سے تاج اور اُن کے نیچے سے تخت بھی کھینچ کر الٹ دینا چاہتا ہے۔ کیونکہ وہ کسی انسان کو محض خلیفۂ وقت ہونے کی بنا پر یہ حق دینا جائز نہیں رکھتا کہ لاکھوں انسانوں کے سر پر ٹوپیاں ہوں مگر اس کا سر ہیروں اور موتیوں سے لیپا جائے۔

مدینے کا وہ قدوس بادشاہ چٹائی پر سوتا تھا اور اُس کے جسم مبارک پر داغ پڑ جاتے تھے۔ اس کے جانشین عین اس وقت جب کہ روم و عجم کے تخت الٹنے کے لیے حکم دینے والے تھے۔ پھٹے کپڑوں کو جسم پر رکھتے تھے اور پتوں کی جھونپڑوں کے نیچے سوتے تھے

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

نہیں چھپتا، وہ سوسائٹی سے مردود و مطرود نہیں ہے۔ اُسی نے بلونشا کے قانون کو توڑنے اور انسانوں کے آداب و مراسم کی حقارت کا کبھی جرم نہیں کیا۔ وہ ایک شہری ہے۔ جو مثل ایک شریفانہ باشندۂ شہر کے انسانوں میں رہتا ہے اور جسیم اجتماعی میں عضو صحیح کی طرح شامل ہے۔ بایں ہمہ اُس کے اعمال کا کیا حال ہے؟ وہ ڈاکو سے بڑھ کر آبادی کو غارت کرتا، وہ قاتل سے زیادہ انسانی حیات کو موت سے تبدیل کرتا، وہ عادی مجرم سے زیادہ سوسائٹی کو تباہ کرتا، وہ ایک درندہ سے بھی خوفناک تر خون آشام اور بھیڑیئے اور جنگلی سور سے بھی بڑھ کر حیاتِ انسانی کا دشمن ہے۔ پھر ان سب سے زیادہ یہ کہ سخت سے سخت بے رحم ڈاکو کی آنکھوں سے بھی کبھی رحم کا ایک قطرۂ اشک ٹپک پڑتا ہے پر یہ محال قطعی ہے کہ اس کی قساوت و شقاوت کبھی بھی کسی تڑپتے ہوئے جسم اور کسی پکارتی رہتی زبان پہ ایک لمحے، ایک دقیقے اور ایک عشر دقیقے کے لیے بھی ترس کھائے۔

شیکسپیر کے ایک شائیلاک کا ذکر بے سود ہے دنیا میں اس

قافلوں کو تاخت و تاراج کرتے تھے، دوسری طرف صدہا بیوہ عورتیں اور بیکس و مسکین خاندان تھے جن کو فیاض طبع دست کریم اور ایک دریائے بخشش بادشاہ کی طرح امداد و اعانت سے مالا مال کردیتے تھے انگلستان کے قرون متوسط اور ہندوستان کے گذشتہ زمانے کے بڑے بڑے ڈاکوؤں کی نسبت ہر شخص جانتا ہے کہ انھوں نے قصبات و دیہات کی بیکس عورتوں کے لیے باقاعدہ وظائف و مشاہرے مقرر کردیتے تھے۔ اور ریم کے ایک مشہور ڈاکو نے فیلبس سے کہا تھا "میرا مجرم ہاتھ بادشاہ کے مقدس ہاتھ سے زیادہ غریبوں اور بیکسوں کی امداد کرتا ہے، اگرچہ وہ بادشاہ اور میں ڈاکو ہوں۔

یہی حال تقریباً انسان کے تمام بڑے بڑے جرائم کا ہے۔ اور فضیلت انسانیہ پر بڑی سے بڑی زندگی کی تاریکی میں بھی کبھی نہ کبھی اپنی روشنی بے نقاب کردیتی ہے لیکن اس کے مقابلہ میں ایک سود خوار زندگی کو لاؤ، وہ چور نہیں ہے، وہ ایک ڈاکو کے نام سے حقیر و ذلیل نہیں کیا جاتا، لوگ اس سے پناہ نہیں مانگتے بلکہ اس کو ڈھونڈتے ہیں وہ پہاڑی کے غاروں اور جنگلوں کے گنجان گوشوں میں مجرموں کی طرح

خصوصیت نہیں کہ اس کے باوجود جاہلیّت عرب کے اس میں غرق ہونے کے سودخواری کو سب سے بڑا جرم اور معصیت کبیرہ قرار دیا۔

تجارت اور لین دین کی بے رحمیوں، اور عام بے رحمیوں میں بڑا فرق ہے، انسان کے تمام مظالم اور بے رحمیاں ایسی ہیں کہ انسانوں کے لیے کوئی دام اور کشش اپنے اندر نہیں رکھتیں۔ وہ از سرتاپا نفرت اور مغبوضیت ہیں۔ لوگ ان سے پناہ مانگتے ہیں لیکن روپے کا لین دین ایک ایسی شے ہے کہ خواہ کیسے ہی سخت سے سخت عنوان سے ظلم ہو، لیکن چونکہ احتیاج اور ضرورت کو وقتی اور فوری طور پر دور کرنے والی ہے، اسی لیے انسان اس سے بھاگ نہیں سکتا بلکہ پناہ مانگنے کی جگہ خود اس کی طرف دوڑتا ہے وہ جانتا ہے کہ سودخوار ایک بے رحم ڈاکو اور خونخوار درندہ ہے لیکن جنگل کے ڈاکو سے نفرت کرتا اور اس شہری ڈاکو کے آگے عاجزی سے ہاتھ جوڑتا ہے تاکہ وہ اسے اپنے دام ظلم میں پھنسانے کے لیے چن لے اور اس کو مجروح تیغ قساوت و بے رحمی کرنے سے انکار نہ کرسکے

وقت تک کتنے ہزار شائیلاک گزر چکے ہیں اور کتنے ہمارے سامنے موجود ہیں۔

ایک اہم نکتہ

اگر ایک شخص چور ہے، ڈاکو ہے، قاتل ہے، تو قانون اس کو قتل کرے گا اور انسانی آبادی اس سے پناہ مانگے گی، لیکن ایک سود خوار جو کہتا ہے کہ "انما البیع مثل الربٰوا" اس کا کیا علاج ہے؟ اس نے تجارت کی ایک دکان کھول دی ہے اور ضرورت و احتیاج انسان کے ہوش و حواس کو معطل کر دیتی ہے۔ لیکن "شائیلاک" کے پاس تو اس کا مظلوم قرض دار خود ہی دوڑ دوڑ کر گیا تھا۔ پس فی الحقیقت قتل و غارت کسی قانون اور مذہب کے لیے اس درجہ سختی کے مستحق نہیں ہو سکتے جس قدر کہ سود اور سود خوار کی زندگی۔

پھر کیا "حرب من اللہ ورسولہٖ" سے اس کی تعبیر صحیح نہیں؟ اور کیا تمام مذاہب عالم میں اسلام کی یہ سب سے بڑی

ہے۔ وہ چونکہ ہمیشہ اپنی بے رحمی کے شکاروں کی مظلومی کو دیکھتا رہتا ہے، اور اُن کی بے قراریوں کے معائنہ کا اپنے دماغ کو عادی بناتا رہتا ہے۔ اس لیے رفتہ رفتہ اس کے تمام قوائے ملکوتیہ پر ایک عالم ممات طاری ہو جاتا ہے اور رحم و ہمدردی کے جذبات اس طرح بیکار و معطل ہو جاتے ہیں کہ قوی سے قوی محرک بھی ان کو زندہ نہیں کر سکتا۔

یہ کیا بات ہے کہ ڈاکو رحم کرتا، مگر سود خوار کی آنکھیں ہمیشہ خشک رہتی ہیں، اس کا سبب یہی ہے کہ ظلم کا استمرار اور بے رحمی کی مداومت ڈاکو کو نصیب نہیں جیسی اور جس قدر کی بے رحمی میں ایک سود خوار کی زندگی بسر ہوتی ہے۔

:ر: ر: ر: ر: ر: ر:

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اور تمام ہزار ہا انسانی بے رحمیاں کسی آبادی کو اس طرح نقصان نہیں پہنچا سکتیں جس درجہ پورے شہر میں ایک "سود خوار" کا وجود پہنچا سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم اس کو سب سے بڑی وعید الٰہی کا مستحق قرار دیتا ہے۔

اس کی علّت اصلی

اصل یہ ہے کہ کسی خود غرضی کے عمل اور بے رحمی کے کام میں اس درجہ استمرار اور مداومت نہیں ہے جیسی کسی کاروباری بے رحمی میں۔ قاتل ایک شخص کو چند لمحوں میں قتل کر ڈالے گا، ڈاکو ایک گھنٹے کے اندر ایک قافلہ کو لوٹ لے گا لیکن سود خوار کا عمل ظلم دائمی، اور انسانی عمروں، خاندانوں اور نسلوں تک جاری رہتا ہے اور جب تک ہمیشہ کے لیے اس کے تڑپنے، لوٹنے اور کراہنے کے نظارہ کا عمل اپنے اندر پیدا نہ کرے وہ سود خوار نہیں بن سکتا۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کی قساوت و بے رحمی سب سے زیادہ سخت اور تمام جرائم کے عادیوں سے زیادہ مستقل و محکم ہوتی

ایک مستقل سرخی رکھی۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ ابھی ابھی ۲۷ راکتوبر کی تقریر میں ہم نے علانیہ مسلمانوں کو جہاد کی دعوت دی۔ اور وہی کہا جو مسلمانوں کو ہمیشہ کہا گیا ہے کہ:

"جَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ"

یہ بھی سچ ہے کہ ہم جابجا قرآن کریم کی ان آیتوں کو جن میں جہاد کا ذکر ہے۔ موجودہ حالت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں اور دراصل یہی ہمارا جرم حقیقی ہے کہ یہ قرآن نامی ایک کتاب ہے جسے ہم ترک نہیں کر سکتے۔ یہ تمام صحیح اور ناقابل تاویل واقعات ہیں۔ جن کو قبل اس کے کہ اور لوگ تلاش و جستجو کے بعد مرتب کریں ہم نے خود ہی یہاں جمع کر دیا ہے لیکن پھر ہم نہیں سمجھتے کہ ہم سے کیا چاہا جاتا ہے؟ ہم نے اگر جنگ طرابلس اور بلقان کو لفظ جہاد سے تعبیر کیا تو درحقیقت یہ ہمارا ایک احسان عظیم ہے کہ مسیحی دنیا کو اسلام کی رحمت سے اب بھی محروم رکھنا نہیں چاہتے۔ اگر ہم نے کہا کہ مسلمانوں کے لیے طرابلس اور بلقان میں ایک معرکہ جہاد گرم ہے نہ کہ قتال تو فی الحقیقت یہ کہہ کر ایک بہت بڑے خطرۂ عظیم کو یورپ کے سر

جہاد یا قتال

آج سے نہیں بلکہ عرصہ سے ہم کو معلوم ہے کہ بعض مختسب حلقوں میں ہماری نسبت کیا خیال کیا جاتا ہے؟ ہم جانتے ہیں کہ من جملہ اور بہت سی باتوں کے ایک لفظ "جہاد" کا اعادہ تکرار بھی ہے۔ بہت سے لوگ ہیں جو اس لفظ کو سن کر سر سے لے کر پاؤں تک کانپ اٹھتے ہیں اور "الہلال" کی سطروں پر انگلیاں رکھ کر گننا شروع کر دیتے ہیں کہ یہ لفظ ہر صفحہ میں کتنی مرتبہ استعمال کیا گیا ہے۔ بیشک ہم نے آغاز جنگ طرابلس کے وقت جو تقریر کی تھی اُسی میں جنگ طرابلس کو جہاد سے تعبیر کیا تھا۔ اور ۱۹۱۰ء کو ایک اسلامی اور یورپ کی اصطلاح کے مطابق ایک دینی جنگ بتلایا تھا۔ اس میں بھی شک نہیں کہ "الہلال" کے صفحوں پر ہم نے ہمیشہ اس جنگ کو جہاد قرار دیا۔ اور "نامورانِ غزوۂ طرابلس" کی

کچھ ہوسکتا ہے کیونکہ مسلمانوں کے آگے "ایک مدنی جنگ" ہوگی نہ
کہ دینی۔ لیکن اگر ہم نے موجودہ لڑائیوں کو قتل دینی سے تعبیر کیا اور
اُس کو (بزعم یورپ) ایک حرب دینی قرار دیا تو پھر معاً ہمارے
ہاتھ بندھ جائیں گے۔ ہماری تلوار مقید ہوجائے گی۔ اس کی خود
مختاری اور بے روک آزادی قائم نہیں رہے گی کیونکہ اس کو حکم
قرآنی کی سلطنت کے ماتحت ہوجانا پڑے گا جو کہتا ہے۔

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللهِ	اللہ کی راہ میں صرف ان کو قتل کرو جنہوں
الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ	نے تمہارے ساتھ مقاتلہ کیا، اور زیادتی
وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللهَ	مت کرو۔ اللہ تعالیٰ ظلم و زیادتی کرنے
لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ	والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

پس ہمارے لیے معصیت ہوجائے گا۔ ہم اپنے خدا کی نظروں
میں مغضوب ہوجائیں گے اگر ان لوگوں کے سوا جو مسلمانوں کے مقابلہ
میں صف آرا ہیں کسی دوسرے غیر مسلم کو اپنا مخالف سمجھیں گے اور
کوئی ادنیٰ قسم کا بھی نقصان پہنچائیں گے۔ کیونکہ پھر ہماری تمام جنگ
اَلَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ میں محدود و مقید ہوجائے گی۔ قرآن

سے ٹال دیا۔ جس میں عجیب نہیں کہ وہ کسی وقت گرفتار ہو جاتا۔ کیونکہ اگر ہم موجودہ لڑائیوں کو جو یورپ کا جدید کروسیڈ اسلام کے مقابلہ میں جاری کیے ہوئے ہے اپنی دین جنگ کی جگہ مسیحیت کی "مدنی جنگ" سمجھ لیں تو یورپ یاد رکھے کہ پھر ہمارا وجود یقیناً اس کے لیے ایک بے امان خطرہ ہو جائے گا۔ پھر ہمارے سامنے بھی یورپ کی جنگ مدنی کا نمونہ اتباع و پیروی کے لیے آجائے گا۔ پھر ممکن ہے کہ مسلمان بھی مقابل فریق جنگ کے سوا ہر وجود مسیحی کو ویسا ہی مستحق قتل و غارت سمجھ لیں۔ جیسا کہ ۲۶ اکتوبر کو جنرل کینوا نے طرابلس کی مدنی جنگ میں سمجھا تھا۔ ممکن ہے کہ ان کی تلوار بھی کسی بوڑھے مرد اور کسی کمزور عورت کو مستثنیٰ نہ کرے جس طرح شہر طرابلس میں اٹلی کے جنگ جویانِ تمدن نے کیا تھا۔ کچھ بعید نہیں کہ وہ بھی مقتول لاشوں کے اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کریں جس طرح جنگ روم و روس میں روسی کاسکوں نے ترکی لاشوں کے ساتھ کیا تھا۔ اور کیا عجیب ہے کہ اختتام جنگ کے بعد وہ بھی اپنے کسی دشمن کی لاش کو قبر سے نکال کر لٹکا دیں جس طرح سوڈان کے فاتح کو کرنا پڑا تھا۔ یہ سب

(اگرچہ وہ محارب جماعتوں کے ہم جنس و ہم مذہب ہی ہوں) دوستی وحسن معاملت سے نہیں روکا جاتا لیکن پھر اس کو بھی اظہار رافت و رحمت کے لیے کافی نہیں سمجھا اور دوسری آیت میں مکرر نہی کا حصر کیا گیا، تاکہ مطلب واضح ہو اور حکم بالکل غیر مشتبہ ہو جائے "انما" حصر کے لیے تھا مگر "فاولئک ھم الظالمون" بھی افادۂ محض حصر کرتا ہے۔ پس اگر ایک حصر دین ہو گا تو ہمارے لیے محال ہو جائے گا کہ فریق جنگ کے اعمال کا ان کی پوری جنس اور قوم کو ذمہ دار سمجھیں۔ اس صورت میں ہم متمدن نہ ہوں گے بلکہ مسلمان ہوں گے۔ اور ہمارے تمام اعمال تابع اسلام ہو جائیں گے۔ ہم دیکھیں گے کہ طرابلس میں ایک مسیحی قوم ہم پر ظلم و ستم کر رہی ہے لیکن ہم ہندوستان میں تمام عیسائیوں سے دوستی و حسن معاملت کے ساتھ پیش آئیں گے۔ اور ان کو اپنا دشمن نہیں سمجھیں گے۔ کیونکہ یورپ کی مدنیت نہیں۔ مگر خدا نے ہم کو ایسا ہی حکم دیا ہے۔ ہم دیکھیں گے کہ بلقان کی مسیحی سازش اور ان کے یورپین پس پردہ معاون محض ظلم و عدوان سے ہم پر حملہ آور ہیں مگر ہم ہندوستان میں

نے ہم کو حکم دیا ہے کہ

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ
الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ
فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ
مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ
وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ اِنَّ
اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ
اِنَّمَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ
الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي
الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ
مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا
عَلٰٓي اِخْرَاجِكُمْ اَنْ
تَوَلَّوْهُمْ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ
فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ

جن لوگوں نے تم سے دین کے بارے جنگ
نہیں کی اور تم کو گھروں سے نہیں نکالا۔
اللہ اس سے نہیں روکتا کہ تم اُن کے
ساتھ احسان اور بھلائی کرو اور انصاف
کے ساتھ پیش آؤ۔ کیونکہ اللہ عدل کرنے
والوں کو محبوب رکھتا ہے۔ اللہ تم سے
صرف اُنہی لوگوں سے میل میلاپ کرنے
سے روکتا ہے۔ جنہوں نے تم سے مقابلہ
کیا۔ اور تم کو گھروں سے نکالا، تمہارے
دشمنوں کی مدد کی، بیشک جو شخص ایسے
لوگوں سے دوستی رکھے گا۔ اس کا شمار
مسلمانوں پر ظلم کرنے والوں میں ہوگا۔

پہلی آیت میں نفی کی نہی کر دی گئی تھی کہ غیر محارب جماعتوں سے

اخلاقی اور سیاسی انقلاب

تاریخ اسلام میں سینکڑوں واقعات ایسے ملتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی فتوحات کے سیلاب نے بہت سی قوموں کو دفعتہً بالکل بدل دیا۔ ہندوستان میں ہمیشہ کے نیچے جو چھپے ہوئے سرنشہ غرور تفریح و فرنگی مآبی میں بدمست نظر آتے ہیں۔ جب ان کو ہوش آئے گا تو معلوم ہوگا کہ وہ عقل وبصیرت کی جگہ ایک ایسا ذلیل ترین دماغ رکھتے ہیں جو درپردہ اپنے ضعف اور دوسری قوموں کی قوت کا مہلک اعتراف کر رہا ہے۔ بلکہ یہی انجذاب قومی ہے جو اُن کی جبین نیاز کو اکثر ان کی چوکھٹ پر جھکا دیا کرتا ہے

یہ انقلاب اگرچہ بظاہر اپنے اندر بہت سی اخلاقی خوبیاں بھی دکھلاتا ہے یعنی فاتح قوم کے دل و دماغ جن اعلیٰ جذبات

کسی یورپین کو حتی کہ کسی بلغاوی یا سروین کو بھی تیز نظر سے نہ دیکھ سکیں گے۔ کیونکہ اُس نے اسلام کے مقابلہ میں تلوار نہیں اُٹھائی ہے۔ اور اگر ہم میں سے کوئی اس کے خلاف کرے گا تو وہ حسب تعلیم قرآن خدا کی نظر میں مغضوب، اس کی محبّت سے محروم اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مسلمان نہ ہو گا۔

پھر ہم کو ہمارے مخالفین صاف صاف بتلا دیں کہ ان دونوں صورتوں میں سے وہ کونسی صورت پسند کرتے ہیں؟ جنگ مدنی یا جنگ دینی؟ قتال وحرب یا قتال جہاد؟ اگر جہاد کا لفظ اُن کو خوش نہیں آتا تو اعلان کر دیں تاکہ ہم بھی حرب دینی کو چھوڑ کر یورپ کی مدنی جنگ کو سیکھنے کی کوشش کریں۔

....

لیکن انگریزوں کا سا اعلیٰ کیرکٹر اور قومی حریت تعلیم یافتہ لوگوں میں بھی یکسر مفقود ہے۔

جنگ کے ذریعہ بعض اوقات فاتح قوم میں بعض نہایت شرمناک بداخلاقیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ فوج ایک مدت تک گھر سے باہر میدان جنگ میں اقامت گزیں رہتی ہے۔ زمانۂ جنگ میں اس کے جذبات وتواتر سخت ہیجان کی حالت میں رہتے ہیں۔ بدامنی اس کو بہت کچھ مطلق العنان بنا دیتی ہے۔ اس لیے اس کے جذبات بہیمیہ سخت مشتعل ہو جاتے ہیں۔ اور وہ اس آگ کو ہر ممکن طریقہ سے بجھانا چاہتی ہے پس مفتوح قوموں کی ہر چیز حالت جنگ میں مباح ہو جاتی ہے۔ عرب میں متعہ کا رواج اسی بنا پر ہو گیا تھا جس کو اسلام کی اخلاقی تعلیم نے بتدریج مٹا دیا ایران میں عشق رجال کا رواج انہی غلاموں کے ذریعہ سے ہوا جو لڑائیوں میں گرفتار ہو کر آتے تھے۔ رفتہ رفتہ انھوں نے اس قدر مقبولیت حاصل کر لی کہ فارسی لٹریچر کا ایک جزو لاینفک بن گئے۔ جن کو اگر علیحدہ کر دیا جائے تو فارسی شاعری کا دامن حسن وعشق سے خالی ہو جائے

سے لبریز رہتے ہیں ۔مفتوح قوم بھی ، انہی کو جذب کرنا چاہتی ہے لیکن سیلاب جب آتا ہے تو گوہر و مرجان سے زیادہ اپنے ساتھ خس و خاشاک کا ڈھیر بہا لاتا ہے اور اپنی یادگاریں اسی کو چھوڑ کر آگے چلا جاتا ہے ۔ زمین کے حصے میں صرف یہی ڈھیر آتا ہے اور ایسے خوش قسمت بہت کم ہوتے ہیں جو صرف گوہر و مرجان سے اپنے دامن و جیب کو بھر لیتے ہیں ۔ فاتحانہ حیثیت سے اخلاقی و تمدنی انقلاب بھی بالکل اسی طرح اضطراری طور پر ہوتا ہے اس لیے انسان کی قوت انتخاب بالکل بیکار ہو جاتی ہے اور فاتح جو کچھ دے دیتا ہے اُسی کو جبراً قبول کر لینا پڑتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مفتوح قوم فاتح قوموں کی تقلید میں سینکڑوں غیر ضروری و غیر مفید بلکہ مضر چیزیں اختیار کر لیتی ہے اور خس و خاشاک کے ڈھیر میں صدف و گوہر بالکل چھپ جاتا ہے ۔ فاتح قوم کی جو خوبیاں مفتوح قوم میں منتقل ہوتی ہیں ، ان کا اثر صرف چند مخصوص افراد ہی میں نمایاں ہوتا ہے ۔ ہندوستان میں کوٹ پتلون پہن کر چلنے پھرنے والے ہر سڑک پر نظر آ سکتے ہیں

ابھارا تھا۔ اور اسی کے تنزل نے اُن کو موجودہ گمنامی تک پہنچا دیا۔

ولعل اللہ یحدث بعد ذٰلک امرًا۔

ابتداء میں اہل عرب اس مرض سے بالکل نا آشنا تھے یہی وجہ ہے کہ بزم شاعری کا دامن اس داغ سے بالکل پاک نظر آتا ہے لیکن جب اہل عرب کی فتوحات کا سیلاب بڑھا اور اسلام کے دامن میں بھی حلقہ بگوش غلام آئے تو ابتداء میں فوجی خیموں کے اندر ان کو دخل ہوا، پھر خلفائے عباسیہ کی بزم طرب کے شمع و چراغ ہو گیے۔ یہاں تک کہ ابن نصر عباسی نے عربی شاعری کے دامن پر بھی اس داغ کو لگا دیا۔

عیش پرستی کی یہ آخری سرحد ہے اور یہیں پہنچ کر ہر قوم فنا ہو جاتی ہے۔ آج جو لوگ عظیم الشان قوموں کی موت پر ماتم کرتے ہیں ان کو صرف مادی طاقت ہی پر نظر نہیں رکھنی چاہیئے۔ بلکہ ان اخلاقی تغیرات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے جو سطوت عامہ کے جزو لاینفک ہیں۔ اس طرح کی حکیمانہ نگاہ سے ثابت ہو جائے گا کہ ترقی و تنزل صرف اخلاقی انقلابات کا نتیجہ ہیں۔ اس زبردست قوت کے سامنے مادی قوت نے ہمیشہ سر تسلیم خم کر دیا ہے۔ عرب کو اس اخلاقی طاقت نے

میرے لیے اس سے بڑھ کر اور کسی مہینے میں ماتم نہیں، کیونکہ اس مہینے میں پیدا ہونے والے نے جو کچھ ہمیں دیا تھا۔ وہ سب کچھ ہم نے کھو دیا۔ اس لیے اگر یہ ماہ ایک طرف بخشنے والے کی یاد تازہ کرتا ہے تو دوسری طرف کھونے والوں کے زخم کو بھی تازہ ہو جانا چاہیئے۔

ما خانہ رسیدگانِ ظلیم

پیغام خوش از دیار مانیست

تم اپنے گھر دل کو محلسوں سے آباد کرتے ہو، مگر تمہیں اپنے دل کی اُجڑی ہوئی بستی کی بھی کچھ خبر ہے؟ تم کافوری شمعوں کی قندیلیں روشن کرتے ہو۔ مگر اپنے دل کی اندھیاری کو دور کرنے کے لیے کوئی چراغ نہیں ڈھونڈتے تم پھولوں کے گلدستے سجاتے ہیں، مگر آہ! تمہارے اعمال حسنہ کا پھول مرجھا گیا ہے تم گلاب کے چھینٹوں سے اپنے رومال و آستین کا معطر کرنا چاہتے ہو مگر آہ تمہاری غفلت کہ تمہاری عظمت اسلامی کی عطر بیزی سے دنیا کی مشام روح یکسر محروم ہے! کاش تمہاری مجلسیں تاریک ہوتیں، تمہارے اینٹ اور

ولادت نبی صلی اللہ علیہ وسلم

(جشن حصول و ماتم ضیاع)

لیکن جب کہ تم اس ماہ مبارک میں یہ سب کچھ کرتے ہو اور اس ماہ کے واقعۂ ولادت کی یاد میں خوشیاں مناتے ہو تو اس کی مسرتوں کے اندر تمہیں کبھی اپنا وہ ماتم بھی یاد آتا ہے جس کے بغیر اب تمہاری کوئی خوشی نہیں ہو سکتی؟ کبھی تم نے اس حقیقت پر بھی غور کیا ہے کہ یہ کس کی پیدائش ہے جس کی یاد کے لیے تم سروسامان جشن کرتے ہو؟ یہ کون تھا جس کی ولادت کے تذکرہ میں تمہارے لیے خوشیوں اور مسرتوں کا ایسا غریز پیام ہے؟

آہ! اگر اس مہینے کی آمد تمہارے لیے جشن و مسرت کا پیام ہے کیونکہ اس مہینے میں وہ آیا جس نے تم کو وہ سب کچھ دیا تھا، تو

جشن و مسرت کی بزم آرائیوں سے مہلت نہیں، حالانکہ اس کے جشن و طرب کے ہر دور میں ایک نہ ایک پیام ماتم و عبرت بھی رکھ دیا گیا ہے بشرطیکہ آنکھیں دیکھیں، کان سنیں اور دل کی دانائی غفلت و سرشاری نے چھین نہ لی ہو۔

ماہِ ربیع الاول کی یاد میں ہمارے لیے جشن و مسرت کا پیام اس لیے تھا کہ اس مہینے میں خدا کا وہ فرمان رحمت دنیا میں آیا جس کے ظہور نے دنیا کی شقاوت و حرمانی کا موسم بدل دیا ظلم و طغیان اور فساد و عصیان کی تاریکیاں مٹ گئیں۔ خدا اور اُس کے بندوں کا ٹوٹا ہوا رشتہ جڑ گیا۔ انسانی اخوت و مساوات کی یگانگت نے دشمنیوں اور کینوں کو نابود کر دیا اور کلمۂ کفر و ضلالت کی جگہ کلمۂ حق و عدالت کی بادشاہت کا اعلانِ عام ہوا۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ	اللہ کی طرف سے تمہاری جانب ایک نور
نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ	ہدایت اور کتابِ مبین آئی۔ اللہ اس کے
يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ	ذریعے اپنی رضا چاہنے والوں کو سلامتی
اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ	اور زندگی کی راہوں پر ہدایت کرتا اور اُن

چونے کے مکانوں کو زیب و زینت کا ایک ذرہ نصیب نہ ہوتا تمہاری آنکھیں رات بھر مجلس آرائیوں میں نہ جاگتیں، تمہاری زبانوں سے ماہ ربیع الاوّل کی ولادت کے بیے دنیا کچھ نہ سنتی، مگر تمہاری روح کی آبادی معمور ہوتی، تمہارے دل کی بستی نہ اُجڑتی، تمہارا طالع خفتہ بیدار ہوتا، اور تمہاری زبان سے نہیں مگر تمہارے اعمال کے اندر سے اسوۂ حسنہ نبوی کی مدح و ثنا کے ترانے اُٹھتے:۔ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ۔

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ، تو نہ مرجائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

پھر آہ وہ قوم، اور صد آہ اس قوم کی غفلت و نادانی جس کے لیے جشن و مسرت میں پیام ماتم ہے، اور جس کی حیاتِ قومی کا ہر قہقہہ عیش فغان حسرت ہو گیا ہے، اگر نہ تو ماضی کی عظمتوں میں اس کے لیے کوئی منظر عبرت ہے۔ نہ حال کے واقعات و حوادث میں کوئی پیام تنبیہہ و ہوشیاری ہے، اور نہ مستقبل کی تاریکیوں میں زندگی کی کسی روشنی کو اپنے سامنے رکھتی ہے۔ اسے اپنی کام جوئیوں اور

موسم ربیع شروع ہوا۔ پھر اگر آج دنیا کی عدالت سموم ضلالت کے جھونکوں سے مرجھا گئی ہے۔ تو اے غفلت پرستو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ بہار کی خوشیوں کی رسم تو مناتے ہو مگر خزاں کی پامالیوں پر نہیں روتے۔

یادگارِ حریت

تم ربیع الاوّل میں آنے والے کی یاد اور محبت کا دعویٰ رکھتے ہو اور مجلسیں منعقد کر کے اس کی مدح و ثنا کی صدائیں بلند کرتے ہو لیکن تمہیں کبھی بھی یاد نہیں آتا جس کی یاد کا تمہاری زبان دعویٰ کرتی ہے۔ اس کی فراموشی کے لیے تمہارا ہر عمل گواہ ہے اور جس کی مدح و ثنا میں تمہاری صدائیں زمزمہ سرا ہوتی ہیں، اس کی عزت کو تمہارا وجود بٹہ لگا رہا ہے؟ وہ دنیا میں اس لیے آیا تھا "تاکہ انسانوں کو انسانی بندگی سے ہٹا کر صرف اللہ کی عبودیت کو صراطِ مستقیم پر چلائے" اور غلامی کی ان تمام زنجیروں سے ہمیشہ کے لیے نجات دلا دے جن کے بڑے بڑے بوجھل حلقے انھوں نے ڈال دیے تھے۔

الاسلام۔ کے آگے صراطِ مستقیم کو کھولتا ہے۔

لیکن دنیا شقاوت و حرمان کے درد سے پھر دکھیا ہو گئی۔ انسانی شر و فساد اور ظلم و طغیان کی تاریکی خدا کی روشنی پر غالب ہونے کے لیے پھیل گئی۔ سچائی اور راست بازی کی کھیتوں نے پامالی پائی اور انسانوں کے بے راہ گلّہ کا کوئی رکھوالا نہ رہا۔ خدا کی وہ زمین جو صرف خدا ہی کے لیے تھی غیروں کو دے دی گئی، اور اُس کے کلمۂ حق و عدل کے غمگساروں اور ساتھیوں سے اس طرح خالی ہو گئی۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ

زمین کی خشکی اور تری دونوں میں انسان کی پیدا کی ہوئی شرارتوں سے فساد پھیل گیا اور زمین کی صلاح و فلاح غارت ہو گئی۔

پھر آہ! تم اس کے آنے کی خوشیاں تو مناتے ہو۔ پر اس کے ظہور کے مقصد سے غافل ہو گئے ہو، اور وہ جس غرض کے لیے آیا تھا، اس کے لیے تمہارے اندر کوئی ٹیس اور چبھن نہیں؟

یہ ماہِ ربیع الاول اگر تمہارے لیے خوشیوں کی بہار ہے تو صرف اس لیے کہ اس مہینے میں دنیا کی خزاں و ضلالت ختم ہوئی اور کلمۂ حق کا

کو ساتھی بناتے؟ کیا ایک مردہ لاش پر دنیا کی عقلیں نہ ہنسیں گی اگر وہ زندوں کی طرح زندگی کو یاد کرے گی۔ ہاں یہ سچ ہے کہ آفتاب کی روشنی کے اندر دنیا کے لیے بڑی ہی خوشی ہے، لیکن ایک اندھے کو کب زیب دیتا ہے کہ وہ آفتاب کے نکلنے پر آنکھوں والوں کی طرح خوشیاں مناتے؟ پھر تم بتلاؤ کہ تم کون ہو؟ تم غلاموں کا ایک گلہ ہو جس نے اپنے نفس کی غلامی، اپنی خواہشوں کی غلامی ماسوائے اللہ رشتوں کی غلامی اور غیر الٰہی طاقتوں کی غلامی کی زنجیروں سے اپنی گردن کو چھپا دیا ہے تم پتھروں کا ایک ڈھیر ہو، جو نہ تو خود ہل سکتا ہے اور نہ اس میں جان اور روح ہے البتہ چور چور ہو سکتا ہے اور ایک دوسرے پر پٹکا جا سکتا ہے۔ تم غبار راہ کی ایک مشت ہو جس کو ہوا اُڑا لے جائے تو اُڑ سکتی ہے ورنہ وہ تو خود صرف اس لیے ہے تاکہ ٹھوکروں سے روندی جائے اور جولانِ قدم سے پامال کی جائے۔

گلگونہ عارض ہے نہ ہے رنگِ حنا تو
اے خوں شدہ دِل، تو تو کسی کام نہ آیا

پس اگر ربیع الاول کا مہینہ دنیا کے لیے خوشی و مسرت کا مہینہ تھا، تو صرف اس لیے کہ اس مہینے میں دنیا کا وہ سب سے بڑا انسان آیا جس نے مسلمانوں کو اُن کی سب سے بڑی نعمت یعنی "خدا کی بندگی اور انسانوں کی آقائی عطا فرمائی اور اُس کو اللہ کی خلافت و نیابت کا لقب دے کر خدا کی ایک پاک و محترم امانت ٹھہرایا۔ پس ربیع الاول انسانی حریت کی پیدائش کا مہینہ ہے۔ غلامی کی موت و ہلاکت کی یادگار ہے۔ خلافت الٰہی کی بخشش کا اولین یوم ہے۔ وراثت ارضی کی تقسیم کا اولین اعلان ہے۔ اسی ماہ میں کلمۂ حق و عدل زندہ ہوا اور اسی میں کلمۂ ظلم و فساد اور کفر و ضلالت کی لعنت سے خدا کی زمین کو نجات ملی۔

لیکن آہ، تم تو اس ماہ حریت کے ورود کی خوشیاں مناتے ہو، اور اس کے لیے ایسی تیاریاں کرتے ہو، گویا وہ تمہارے ہی لیے اور تمہاری ہی خوشیوں کے لیے آیا ہے۔ خدارا مجھے بتلاؤ کہ تم کو اس پاک اور مقدس یادگار کی خوشی منانے کا کیا حق ہے؟ کیا موت اور ہلاکی کو اس کا حق پہنچتا ہے کہ زندگی اور روح اپنے

مبارک کی اصلی عظمت و حقیقت سے بے خبر رہو اور صرف بازوں کے نرانوں، در و دیوار کی آرائشوں اور روشنی کی قندیلوں ہی میں اسی کے مقصد یادگاری کو گم کر دو۔ تم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ ماہ مبارک امت مسلمہ کی بنیاد کا پہلا دن ہے، خداوندی بادشاہت کے قیام کا اولین اعلان ہے، خلافت ارضی و وراثت الٰہی کی بخشش کا سب سے پہلا مہینہ ہے۔ پس اس کے آنے کی خوشی اور اس کے تذکرہ و یاد کی لذت پر اُس شخص کی روح پر حرام ہے جو اپنے ایمان اور عمل کے اندر اس پیغام الٰہی کی تعمیل و اطاعت اور اس اسوۂ حسنہ کی پیروی کے لیے کوئی نمونہ نہیں رکھتا۔

فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ۔



پس اے غفلت کی ہستیو! اور اے بے خبری کی سرگشتہ خواب روحو! تم کس منہ سے اس کی پیدائش کی خوشیاں مناتے ہو جو حریت انسانی کی بخشش، حیاتِ روحی و معنوی کے عطیۂ اور کامرانی و فیروزمندی کی فسردگی وملولی کے سبب آیا تھا، الله الله غفلت کی نیرنگی اور انقلاب کی بوقلمونی، ماسوائے اللہ کی عبودیت کی زنجیریں پاؤں میں ہیں، انسانوں کی ملوکیت ومرغوبیت کے کے حلقے گردنوں میں، ایمان باللہ کے ثبات سے دِل خالی اور اعمال حقہ حسنہ کی روشنی سے روح محروم! ان سامانوں اور تیاریوں کے ساتھ تم مستعد ہو کہ ربیع الاول کے آنے والے کی یاد کا جشن مناؤ جس کا آنا خدا کی عبودیت کی فتح، غیر الٰہی عبودیت کی ہلاکت، حریت صادقہ کا اعلان حق، عدالتِ حقہ کی ملوکیت کی بشارت اور امت عادلہ وقائمہ کے تمکن وقیام کی بنیاد تھا۔ کما لهؤلاء القوم لا یکادون تفقھون حدیثا

پس اے غفلت شعارانِ ملت! تمہاری غفلت پر صد فغان وحسرت اور تمہاری سرشاریوں پر صد ہزار نالہ و بکا، اگر تم اس ماہ

مرکز "قیام و تکمیل" کے نام سے پکارتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے لیے صرف تعلیم ہی کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ تعلیم سے بھی زیادہ ایک "قومی مرکز" کے قائم کرنے کی ضرورت ہے جب تک کہ ایک ایسا مرکز موجود نہ ہوگا، متفرق کوششیں کچھ سود مند نہیں ہو سکتیں پھر اس کے بعد دعویٰ کرتے ہیں کہ علی گڑھ کالج ہی مسلمانوں کا قومی مرکز ہے، اور اس کے قیام و تکمیل پر مسلمان کی تمام حیات و ممات قومی کا دار و مدار ہے۔

ان کی اصل کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس کو دنیا بھر کی چیزوں کا مرکز ثابت کر دیں لیکن جب اس میں کامیابی نہیں ہوتی تو مجبوراً "تعلیمی مرکز" کے قرار دینے ہی پر اکتفا کر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو چاہیئے کہ دین و دنیا کا اور کوئی کام نہ کریں۔ صرف کالج ہی کو پوجیں اور صرف کالج ہی کو روپیہ دیں۔ جَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ۔ اگر وہ ایسا نہ کریں گے اور اور کاموں میں لگ جائیں گے تو مرکز قائم نہ ہوگا، اور مرکز نہ ہوا تو پھر قوم قوم نہیں۔

مجوزہ شیعہ کالج

علی گڑھ کالج و علی گڑھ کانفرنس کے ارباب حل و عقد کا رویہ

علی گڑھ کالج اور علی گڑھ کانفرنس کے ارباب حل و عقد نے ہمیشہ دعویٰ کیا ہے کہ ہمارا موضوع مسلمانوں کی جدید تعلیم اور علی الخصوص اعلیٰ تعلیم ہے۔ ہمارا موضوع پالٹیکس نہیں ہے پس پولٹیکل معاملات میں ہم سے کسی آزادانہ رد لینے کی خواہش کرنا ایک ایسی چیز کا مطالبہ ہے جو ہمارے دائرہ عمل ہی سے باہر ہے۔ البتہ تعلیم کے متعلق ہم سب کچھ کر سکتے ہیں اور کر رہے ہیں۔

انھوں نے مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق ایک خاص اصول وضع کیا ہے اور ہمیشہ سے کہتے آئے ہیں کہ مسلمانوں کی تعلیمی حیات و ممات کا دارومدار اسی اصول پر ہے۔ اس اصول کو وہ "ایک قومی

اور مستقل تعلیمی کوششوں کی مخالفت کرتے رہے حتی کہ لکھنؤ کانفرنس میں اُن کو اسی مسئلہ کے متعلق اس قدر جوش آگیا کہ بہت سے لوگ اس کے متحمل نہ ہو سکے۔ مرحوم سجاد حسین ایڈیٹر اودھ پنچ نے پھبتیاں اڑائیں اور لوگ جلسے سے اُٹھ کر چلے گئے۔

ان تمام امور کے علاوہ سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو اتحاد و جمعیتہ کلمہ کا داعی قرار دیتے ہیں اور اسی بنا پر شیعہ مطالبات کا ایک بڑا حصّہ ان لوگوں نے منظور نہیں کیا، کیونکہ اس کے ماننے سے مسلمانوں میں تفریق بڑھتی۔

مجھ کو یہاں اس سے کوئی بحث نہیں کہ ان کے یہ تمام مسالک و عقاید صحیح ہیں یا غلط؟ بحث صرف یہ ہے کہ ان کے مدعیانہ عقاید کا یہ حال ہے پس اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ مجوزہ شیعہ کالج کا وجود ان کے ان عقاید مسلمہ اور ان کے امام معصوم کے مذہب و ملت کے لحاظ سے کیا حکم رکھتا ہے؟

کیا ایک علیحدہ کالج قائم کرنا اُن کے اصول "مرکزیت" کے لیے پیغام ہلاکت نہیں ہے؟

نیز ان لوگوں نے اپنی تقلید اور پرستش کا ایک نیا بت بنایا ہے اور اس کا نام رکھا ہے "سرسید کی پالیسی" یونانی علم الاصنام میں ہر طاقت کے لیے ایک مخصوص بت ہوتا تھا۔ یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ رزق کا دیوتا علم کے دیوتے کے کاموں میں مداخلت کرے۔ یا کیوپڈ وینس کی حکومت میں خلل ڈالے لیکن ان لوگوں نے صرف ایک ہی بت بنایا ہے۔ اور اس کے اختیارات اتنے وسیع ہیں کہ علم و عمل کا کوئی گوشہ اس سے خالی نہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ ہم "سرسید کی پالیسی" سے سرمو تجاوز نہیں کریں گے اور مسلمان صرف وہی ہے جو "سرسید کی پالیسی" پر نہ صرف ایمان مجمل بلکہ ایمان مفصل کا اقرار کرے

سرسید مرحوم کی پالیسی کا اس بارے میں یہ حال تھا کہ انھوں نے پہلی لکھنؤ کانفرنس اور نیز میرٹھ کانفرنس میں خاص ریزولیوشن پیش کیے کہ جب تک مسلمان اپنی تمام متفرق اور علیحدہ علیحدہ کوششوں کو ترک کر کے ایک مکمل تعلیمی مرکز نہیں بنا لیں گے اُن کی کشتی طوفان ہلاکت سے نہیں نکلے گی۔ چنانچہ انھوں نے اسی ریزولیوشن کا نام "مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ رکھا" اور ہمیشہ دوسرے کالجوں اسکولوں

کانفرنس نے جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اس کا موضوع صرف مسئلہ تعلیم ہے مسئلہ تعلیم قومی کی اِس یکبسر ہلاکت و بربادی کے لیے کون سی صدا بلند کی ہے؟ یہ کیا ہے کہ علی گڑھ کالج کی بستی کا ہر فرد یکبسر بہرا گونگا بن گیا ہے جیسا کہ سرسید نے نہیں بلکہ صاحب شریعت نے کہا ہے کہ الساکت عن الحق شیطان اخرس۔ اور یہ کون ہے جس نے تمام مصالحین قوم، ماہرین فلسفۂ تعلیم اور مجددین مائتہ حاضرہ کی زبانوں پر ایسے قفل چڑھا دیئے ہیں کہ کسی کے حلق سے آواز نہیں نکلتی، اور سب پر ہلاکت کی چپ اور موت کی خاموشی چھا گئی ہے؟ اَمْوَاتٌ غَیْرُ اَحْیَاۗءٍ ۚ وَمَا یَشْعُرُوْنَ اَیَّانَ یُبْعَثُوْنَ۔

تمہارا مسلک مرکزیت اب کہاں فنا ہو گیا؟ تمہاری دعوت قومیت کس گوشے میں دفن کر دی گئی؟ تمہاری چہل سالہ محنت اکارت جا رہی ہے تم کہاں چھپ گئے ہو؟ تمہارے امام معصوم کا مذہب ذبح کیا جا رہا ہے، تم کیوں نہیں بولتے؟ تمہاری شریعت تعلیم مٹائی جا رہی ہے، تمہارے گلوں میں پھندے کیوں پڑ گئے ہیں؟ یا سبحان اللہ! اگر ایک مسلم اللہ اور رسول کے نام کی دعوت دے تو اُس پر

کیا شیعہ کالج کے نام سے اس کی دعوت دینا کلمۂ اتحاد کے لیے فتنۂ عظیم نہیں ہے؟

کیا علی گڑھ کالج کے اندر دو مسجدوں کا بنانا تفریق تھا، مگر "شیعہ کالج" کی بنیاد رکھ کر آب و ہوائے تفریق میں آئندہ نسلوں کو تیار کرنا تفریق نہیں ہے؟ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ شیعہ کالج کی اصل بنیاد علی گڑھ کالج ہی کی مخالفت سے پڑی اور اس طرح علی گڑھ کالج کے احاطہ واثر کو نقصان پہنچایا جا رہا ہے۔ کیا اس کالج کا وجود "سرسید کی مسلمہ پالیسی" اور مسلک مرکز و جمعیتہ فریقین کے لیے جس پر محمڈن کالج کی بنیاد رکھی گئی تھی سخت مہلک نہیں ہے؟ کیا ارکانِ کالج میں ہر شخص کا اعتقاد و علم راسخ نہیں ہے کہ یہ تحریک موجودہ عہد کی سب سے زیادہ مضر تحریک ہے اور اس سے سخت نقصان مسلمانوں کو پہنچے گا۔

اگر ان تمام سوالوں کا جواب اثبات میں ہے تو میں پوچھتا ہوں کہ علی گڑھ پارٹی نے اس وقت تک اس کی مخالفت و اصلاح اور کلمۂ حق کے اعلان کے لیے کیا کاروائی کی ہے؟ آل انڈیا ایجوکیشنل

طاری ہوئی ہے، بلکہ اصل مصیبت یہ ہے کہ تمہارے دل پر موت چھا گئی ہے اور تمہارے ایمان نے تم کو چھوڑ دیا۔ اصل یہ ہے کہ تمہارے صوبے کا سب سے بڑا حاکم علانیہ شیعہ کالج کی تحریک کا ساتھ دے رہا ہے، اور کھلے بندوں اس کی حمایت کر رہا ہے۔ یہ دیکھ کر تمہارے ہوش و حواس غائب ہو گئے ہیں اور مارے ڈر اور ہیبت کے تمہاری جان نکل جا رہی ہے تم دیکھتے ہو مگر بول نہیں سکتے تم کہتے ہو کہ اگر ہم نے ذرا بھی زبان ہلائی تو عجب نہیں کہ ہم دربار شاہی سے مردود ہو جائیں۔ نَخْشٰى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ

یہ ہے تمہاری حق پرستی، یہ ہے تمہاری صداقت، یہ ہے تمہاری مدت العمر کے دعوؤں اور ترانیوں کی کائنات حقیقت! آہ، ایک انسان کے ڈر نے تمہاری روح پر ایسی ہلاکت طاری کر دی ہے کہ تم اس چیز کو زبان سے نہیں نکال سکتے جس کو تمہارا دل حق کہہ رہا ہے۔ اے سست ایمانو! تم انسان سے ڈرتے ہو۔ مگر افسوس کہ تمہارے دل سے خدا کا خوف اس طرح نکل گیا

اپنی کانفرنس کا دروازہ بند کرنا چاہتے ہو، اور کہتے ہو کہ سب سے پہلے سرسید پر ایمان لانے کا اقرار کرلے اس کے بعد وہ تقریر کرسکتا ہے؛ اس کا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ اس نے سرسید کی شریعت سے انحراف کیا، لیکن آج سرے سے علی گڑھ کالج کا اصول بنیادی منہدم کیا جارہا ہے اور سرسید کی مرکزیت کی دھجیاں اڑا رہی ہیں مگر تم سب پر نفاق کی موت طاری ہوگئی ہے، اور تم سب مردوں کی طرح بے حس وحرکت پڑے ہو؛

تم کہتے ہو کہ ہمارا دائرہ عمل قومی تعلیم ہے، سیاست نہیں ہے۔ اچھی بات ہے لیکن اب بتلاؤ کہ یہ جو کچھ ہے سیاست ہے یا تعلیم؟ اگر قومی تعلیم کا مسئلہ ہے تو تمہاری قومیت اور قومی تعلیم کی لن ترانیاں کہاں دفن ہوگئیں؟

تم بھلا ان سوالات کا جواب کیا دو گے، میں خود ہی حقیقت کو بے نقاب کردیتا ہوں تاکہ ہر انسان تمہاری اصل صورت دیکھ لے اور معلوم ہو جائے کہ حق سے تمہارا رشتہ کیا ہے؟ نہ تو تمہارے اعتقادات بدلے ہیں اور نہ ہی تمہارے مسلک پر کوئی موت

انگریزی عہد میں کونسل کی تاریخ میں کالسا انزلی کا تذکرہ

کونسل کے اندر اظہار قابلیت کے متعدد مواقع ہیں۔ سب سے پہلی چیز تو مناسب اور ممکن النفاذ قوانین کا مسودہ پیش کرنا ہے پھر عام مباحث و مذاکرات میں علم و قابلیت اور اجتہاد فکر و رائے کے ساتھ حصہ لینا، ہر معاملہ اور قانون کے متعلق مکمل مصالح اور اغراض کی حمایت کرنا، سرکاری تجاویز و خیالات کے بے اعتدالانہ اثر کی اعتدال و قابلیت کے ساتھ مخالفت کرنا، بجٹ وغیرہ کے اہم مواقع پر عمدہ اور مفید مباحث و انتقادات پیش کرنا۔ ملک کی عام حالت پر نظر رکھنا، اور اسی کے درس و مطالعہ سے کونسل کے کاموں میں مدد لینا، شمار و اعداد کو ہر معاملے کی نسبت خاص طور پر محفوظ رکھنا، اور ہر بحث میں ان سے کام لینا، مفید اور نتیجہ خیز سوالات کرنا، اور ان کے جوابات سے ملک کی عام معلومات

ہے جس طرح کبوتر اپنے گھونسلے سے اُڑجاتا ہے: عَلٰی خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَائِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ (۱۰ : ۸۲)

یہی وہ مقام ہے جہاں اگر تم میرے مقابلے میں بیدست و پا ہو جاتے ہیں، اور تمام دنیا دیکھ لیتی ہے کہ حق کس کے ساتھ ہے؟ اُس کے ساتھ ہے جو اعلانِ حق کی وجہ سے اپنی زندگی کو ہر وقت خطروں اور ہلاکتوں میں گھرا ہوا دیکھتا ہے پھر بھی اعلائے کلمۃ الحق سے باز نہیں رہ سکتا، یا اُن کے ساتھ ہے جو اپنی پنجاہ سالہ کمائی کو صرف ایک انسان کی وہمی خوف اور ہیبت کی وجہ سے اپنے ہاتھوں تاراج کر رہے ہیں؟ فَاَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔



عالم بالا کے لیے بھی بہترین وصف ہے، چہ جائیکہ کونسل ہال میں انسانوں کے لیے کہ :-

لا یسبقونہ بالقول وھم بامرہ یعملون

(سورہ انبیاء میں یہ آیت فرشتوں کی تعریف میں ہے یعنی وہ اللہ کے احکام پر ایسے عامل ہیں کہ اس کے کسی حکم کے خلاف نہیں کرتے)۔

اس سے بھی زیادہ دردانگیز یہ بات ہے کہ بُرائی کے ظہور کی اصلاً دو شکلیں ہوتی ہیں۔ ایک نیکی کا عدم، اور دوسرا بدی پر اصرار۔ پہلی صورت بہتر ہے، اگر دوسری صورت پیش نہ آئے۔ ایک شخص کچھ نہیں کرتا۔ یہ بری بات ہے لیکن اس شخص سے نو و نہزار درجہ بہتر ہے جو نہ صرف یہ کہ نیک کام نہیں کرتا۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ کہ برائیوں پر مصر ہے۔

مرا بخیر تو امید نیست، شرم امسال

مسلمان ممبروں نے اتنا ہی نہیں کیا کہ اپنے وجود سے کچھ کام نہیں لیا، بلکہ اس سے زیادہ یہ کہ جب کبھی کچھ کام لیا بھی تو

اور رائے میں اضافہ اور حکومت کی غلطیوں کا انکشاف کرنا۔
یہ، اور اسی طرح کے صدہا مواقع ہیں کہ ایک قابل شخص کی قابلیت کے لیے کونسل ہال میں آزمائش ہو سکتے ہیں۔

پھر حق گوئی اور راست بیانی ایک جوہر اصلی ہے، جس کی ہر موقعہ پر ضرورت ہے اور جو ایک روشنی ہے، جس سے کونسل ہال ہی نہیں بلکہ ہر جگہ روشن ہو سکتی ہے۔

لیکن افسوس کہ اس تمام عہد گزشتہ دوراں میں مسلمان ممبروں نے ان تمام امور میں سے کسی ادنیٰ ترین کام کا بھی اپنے تئیں اہل ثابت نہیں کیا۔

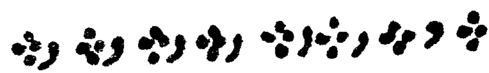
البتہ ایک چیز ہے، جس کی قابلیت کا انھوں نے ہر موقعہ پر ثبوت دیا۔ اور ایسا قاطع و مانع، کہ ہندوستان کی کوئی قوم اس کے مقابلے میں اپنے عجز صریح کو نہیں چھپا سکتی۔ یعنی ملک اور ملکی امیدوں کی تذلیل، جہل و نادانی کے ساتھ ہر سرکاری خواہش کا استقبال، اور ہر صدائے حکومت کے آگے بلا تامل رکوع و سجود۔ اور یہ وہ صفت ملکوتیہ ہے، جو ملاءِ اعلیٰ ذکر و بیان

تحریک آزادی اور مسلمان

جو ہونے والا ہے اس کو کوئی قوم اپنی نحوست سے نہیں روک سکتی۔ یقیناً ایک دن آئے گا جب کہ ہندوستان کا آخری سیاسی انقلاب ہو چکا ہوگا۔ غلامی کی وہ بیڑیاں جو خود اُس نے پاؤں میں ڈال لی ہیں بیسویں صدی کی ہوا نے حریت کی تیغ سے کٹ کر گر چکی ہونگی اور وہ سب ہو چکے گا جس کا ہونا ضروری ہے۔ فرض کر لیجئے کہ اس وقت ہندوستان کی ملکی ترقی کی ایک تاریخ لکھی گئی تو آپ کو معلوم ہے کہ اس میں ہندوستان کے سات کروڑ انسانوں کے متعلق کیا لکھا جائے گا؟

اس میں لکھا جائے گا کہ ایک بدبخت اور زبوں طالع قوم، جو ہمیشہ ملکی ترقی کے لیے ایک روک، ملک کی فلاح کے لیے ایک بدقسمتی، راہِ آزادی میں سنگِ گراں، حاکمانہ طمع کا کھلونا، دست احباب میں بازیچہ لعب، ہندوستان کی پیشانی پر ایک گہرا زخم اور گورنمنٹ کے ہاتھ

یہی کیا کہ ملک کو نقصان پہنچایا۔ اور ہمیشہ اس کی بہترین امیدوں کے لیے ایک سنگِ گراں بن کر حائل راہ رہے۔ یہ ہماری پیشانی پر ایک ایسا داغ سیاہ ہے، جو افسوس کہ مٹ نہیں سکتا۔



دنیا میں اس لیے بھیجی گئی تھی تاکہ انسانی استبداد و استعباد کی زنجیروں سے بندگانِ الٰہی کو آزاد کرائے، جو اس لیے [illegible] گئی تھی کہ بیڑیوں کو کاٹے نہ اس لیے کہ خود اپنے پاؤں میں بیڑیاں پہنے۔ جو اس لیے آئی تھی کہ تمام اُن زنجیروں کو جو خدا کی بندگی کے سوا اور شیطانی قوتوں کی (اور ہر وہ استیلا جو اللہ کے ماسوا ہے اسلام کی اصطلاح میں یہی نام رکھتا ہے) انسان کی گردنوں میں ٹکڑے ٹکڑے کر دے نہ اس لیے کہ سب سے بھاری زنجیر کو خود ہی اپنی گردن کا زیور بنائے جو خدا کی نائب اور خلیفہ تھی؛ تاکہ دنیا کو اپنا محکوم بنائے۔ نہ یہ کہ خود محکومی پر ناز کرے جس کے قدموں پر قوموں کو گرنا تھا نہ یہ کہ وہ خود خاک و ذلت و غلامی پر لوٹے اور ٹھکرائی جائے۔

جو اُس ملتِ حنیفی کی پیرو تھی جو دنیا میں صرف اس لیے ہے کہ حاکم و محمود ہو اس لیے کہ غلام اور مملوک ہو۔ آہ! جو "مسلم" تھی۔ اور پھر کونسا انسانی شرف باقی رہ گیا ہے جو اس اللہ کے منہ سے نکلے ہوئے خطاب محبوب و اقدس میں نہیں ہے جو "مسلم" تھی اور اس لیے قدرتی طور پر اس کا فرض تھا کہ:-

میں ملک کی امنگوں کو پامال کرنے کے لیے ایک پتھر بن کر رہی!
اس میں لکھا جائے گا کہ ایک قابل رحم مگر مسحور انسانوں کا گلہ جس کے
ہر فرد کو کسی زبردست کاہن نے اپنے منتر سے جانور بنا دیا تھا جو اچھے
نچانے والے آقا کے ہاتھ میں اپنی گردن کی رسی دیکھتا تھا اور خوش
ہوتا تھا جس میں کوئی انسانی ارادہ۔ کوئی انسانی دماغ۔ کوئی انسانی حرکت
اور کوئی انسانی زندگی کا ثبوت نہ تھا۔ جو اپنے دماغ سے نہ سوچ
سکتا تھا، نہ اپنی آواز سے بول سکتا تھا۔ نہ اپنے پاؤں سے چل سکتا
تھا اور نہ اپنے ہاتھوں کو اپنا ہاتھ سمجھ کر اٹھا سکتا تھا۔ ایک معمول جو مسمرائزر
کے ارادہ پر زندہ ہو۔ ایک وجود شل۔ جو صرف زمین کے لیے بار ہو،
ایک درخت جو حرکت کے لیے ہوا کا منتظر ہو۔ ایک پتھر جو بغیر کسی غیر کی روح
کے حرکت دیئے ہل نہ سکتا ہو اور سب سے آخر یہ کہ ایک بدبختی کا داغ
جو انسان کی پیشانی پر ہو۔

پھر اس میں لکھا جائے گا کہ یہ حالت اسی قوم کی تھی جو آہ ثم آہ!
کہ "مسلم" تھی جو اپنے ساتھ انسانی شرف و جلال کی ایک عظیم ترین
تاریخ رکھتی تھی جس کو دنیا کی وراثت و خلافت دی گئی تھی۔ جو

یہ کیا ہے کہ ایک آواز میرے کانوں میں آرہی ہے، میں سن رہا ہوں پر تم نہیں سنتے؟ آہ!! اے لوگو کہ میں نہیں سمجھتا، تم کو کیا کہوں، مجھ کو خدارا بتلاؤ کہ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تم دین قویم کے پیرو تھا اسلام سے متصف اور امانت الٰہی کے حامل ہو، یہ سچ ہے تو تم صرف اس لیے ہو تا کہ نڈر رہو، بے خوف ہو، جری ہو، آزاد ہو، خود مختار رہو، نہ صرف اتنا ہی کہ خود آزاد ہو، بلکہ قوموں کو آزادی بخشنے والے، اور ملکوں کو استبداد سے نجات دلانے والے ہو، اور میں آگے بڑھتا ہوں کہ تم اس لیے ہو کہ تم جانفروش ہو تاکہ راہِ حق میں سر بکف ہو پھر یہ کیا ہے کہ سب باتیں غیروں میں دیکھتا ہوں لیکن اے بدبختو تم ان سے محروم ہو کہ یہ کیا بوالعجبی اور کیا تماشا ہے عقل سوز ہے۔

اگر تم کہو کہ تاریخ ہند میں ہمارے لیے بھی ایک شرف و عظمت کا باب ہے تو تم خاموش ہو اور مجھ سے کہو کہ میں اسے پڑھ دوں۔ بیشک ایک باب ہو گا، مگر جانتے ہو کہ اس میں کیا ہو گا؟ اس میں لکھا ہو گا کہ ہندوستان ملکی ترقی اور ملکی آزادی کی راہ میں بڑھا،

ہندوستان کی آزادی اور ملک کی ترقی کا جھنڈا اس کے ہاتھ میں ہوتا اور ہندوستان کی تمام قومیں اس کے پیچھے ہوتیں۔ کیوں کہ اس کے پاس "اسلام" تھا اور "اسلام" آگے رہنے کے لیے ہے پیچھے رہنے کے لیے نہیں۔

وہ ایک قوت ہے تاکہ قومیں اس کے آگے جھک کر روحانی و جسمانی نجات پائیں پر وہ کسی کے آگے جھکنے کی محتاج نہیں ہے دماغ سوچنے کے لیے ہے نہ کہ غفلت کے لیے۔ پس تمہارے پاس دماغ ہے۔ تو اے غفلت کو بیداری، اور موت کو حیات سمجھنے والو! خدارا مجھ کو بتلاؤ کہ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر تمہاری نسبت کیا لکھا جائے گا؟ یقین کرو اس وقت جب کہ یہ سطریں لکھ رہا ہوں میرے دل میں ایک سخت اضطراب ہے۔ میری روح بے چین ہے۔ میرے جگر میں ٹیس ہے، میرے دل کے زخموں کے ٹانکے کھل گئے ہیں اور میرے ہیجان و افکار کا ساتھ دینے سے قلم عاجز آ گیا ہے۔ یہ کیا ہے کہ میں ایک شے کو اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں تم سب کے پاس بھی آنکھیں ہیں مگر تم کو نظر نہیں آتا؟

کو سونا چاندی کھلا کر لٹائی جا رہی تھی مگر ملک کے فی الواقعہ مست کا نے تعلیم اور حفظان صحت کے انتظام سے محروم تھے نمک بھی ملتا تو محصول دے کر، اور تعلیم بھی ملتی تو گھر بار بیچ کر۔ پھر زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے محبت کے لہجہ میں وعدہ کیا گیا کہ تمیز رنگ و زبان اور امتیاز حاکم و محکوم کا یہاں سوال نہیں اور جو راہ اپنے لیے باز ہے۔ وہی سب کی آمد کی منتظر لیکن جب پاؤں اُٹھے اور ہاتھوں نے حرکت کی تو تمام دروازے بند تھے اور امتیاز حاکم و محکوم کے نشے سے ہر انگلستان کی مٹی کا پتلا مخمور۔

یہ اور ایسے ہی حالات تھے جن میں ملک مبتلا تھا۔ ہندو اُٹھے اور اُنھوں نے اپنی تمام قوتوں کو ملکی جہاد کے لیے صرف کر دیا۔ لیکن عین اس وقت جب کہ وہ یہ سب کچھ کر رہے تھے مسلمانوں نے نہ صرف اپنے ہی ہاتھ پاؤں توڑے بلکہ چاہا کہ جن کے ہاتھ۔ پاؤں ہیں ان کو بھی اپنا سا لنگڑا لولا بنا دیں۔ جب کہ وہ ملک اور ملک کی آزادی کی آگ سلگا رہے تھے۔

ہندوؤں نے اس کے لیے اپنے سر کو ہتھیلی پر رکھا مگر مسلمان غاروں کے اندر چھپ گئے۔ انھوں نے پکارا، مگر انھوں نے اپنے منہ اور زبان پر قفل چڑھا دیئے۔ ملک غیر منصفانہ قوانین کا شاکی تھا۔ ہندوؤں نے اس کے لیے جہاد شروع کیا، پر اس قوم مجاہد نے یہی نہیں کیا کہ صرف چپ رہی بلکہ مجنونانہ چیخ اٹھی کہ تمام کام کرنے والے باغی ہیں۔

ملک کہ ایک خاص زرعی ملک تھا۔ اس کے کاشتکار تباہ ہو رہے تھے۔ ملک کی دولت انگلستان کے معدے میں بھری جا رہی تھی اور اس طرح ہضم ہو جاتی تھی کہ چند لمحوں کے بعد پھر ھل من مزید کا نعرہ سنائی دیتا تھا۔ ریلوے کی توسیع کے انگلستان کو ٹھیکے دیئے جا رہے تھے تاکہ وہ دولت جذب کرے مگر آب پاشی کے لیے روپیہ نہ تھا کہ ہندوستان کی زمین اپنی دولت اگلے۔ زبان سے اقرار کیا جاتا تھا کہ وفادار ہو مگر اسلحہ چھونے کی اجازت نہ تھی کہ تم غدار ہو، ملک کی تمام دولت ستر ہزار سرخ رنگ سپاہیوں

ہوئی ۔ نئے مفید قوانین بنائے گئے، برباد کن محصولوں اور ٹیکسوں سے انسانوں نے نجات پائی، تعلیم جبری اور عام ہوئی فوجی مصارف میں تخفیف ہوئی اور سب سے آخر یہ کہ ملک کو حکومت کی خود اختیاری ملی تو صرف ہندوؤں۔ قابل عزت ہندوؤں، مسلمانوں کے لیے تازیانہ عبرت ہندوؤں کی وجہ سے کیونکہ انھوں نے پالیٹکس شروع کیا، اور پھر پالیٹکس اسی کو سمجھا، مگر مسلمانوں نے اس کو معصیت سمجھ کر کنارہ کشی کی، اور جب شروع بھی کیا تو شیطان نے سمجھایا کہ گورنمنٹ کے آگے سجدہ کریں یا اس کے آگے بھیک مانگنے کے لیے روئیں اور پھر مانگیں بھی تو اشرفی نہیں ۔ چاندی سونا نہیں لعل و جواہر نہیں بلکہ تانبے کا ایک زنگ آلود ٹکڑا یا سوکھی روٹی کے چند ریزے ۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

تو یہ تعلیم کی ایک ٹھنڈی لاش لیے بیٹھے تھے ان کے کانوں میں ایک جادو کا منتر پھونک دیا گیا تھا کہ "وقت نہیں آیا" اور یہ اسی میں مسحور رہتے۔ ایک الف لیلہ کا عفریت تھا جس نے جادو کے زور سے ان کو پتھر کی چٹان بنا دیا تھا۔ پس یہ ملک کی راہ میں روک بن کر پڑے رہے۔

اس کے بعد وہ آنے والا مورخ جو ہندوستان کا وقائع نگار ہوگا، لکھے گا بالآخر وہ سب کچھ ہوا جو ہونا تھا، بیسویں صدی میں کوئی غلام نہیں رہ سکتا تھا، اور نہیں رہا۔ برٹش گورنمنٹ ایک کانسٹی ٹیوشنل گورنمنٹ تھی۔ چنگیز خاں کا تختِ قہر نہ تھا۔ پس ملک آزاد ہوا اور انگلستان نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ لیکن دنیا یاد رکھے کہ جو کچھ ہوا، اس قوم کی سرفروشی سے ہوا، جو مسلم نہ تھی، پر جو "مسلم" تھے انھوں نے ہمیشہ آزادی کی جگہ غلامی کی اور سربلندی کی جگہ سجدۂ ذلت کی کوشش کی۔ ہندوستان کی ملکی نجات یقیناً ایک عظمت و عزت کی یادگار ہے لیکن اس عزت میں مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں۔ اگر ملک کے قوانین کی ترمیم

یا تو انگریزی اقتدار کے سہارے جئیں یا کانگرس کے اطمینان دلانے پر، اور خود ان کے اندر خود اعتمادی و ہمت کی ایک چنگاری بھی نہیں رہی۔ جو ان کی ٹھنڈی رگوں کو گرم کر سکے تو میں کہوں گا کہ ایسی زندہ نعشوں کے لیے یہی بہتر ہے کہ جہاں پڑی ہیں پڑی رہیں۔ وہ نہ تو انگریزی اقتدار کی طرف دیکھیں نہ کانگرس کی طرف وہ خود داری کے منافی مستقبل کے فیصلہ کا انتظار کریں۔ یہ ان کی چودہ صدیوں کی تاریخ کا کم سے کم مطالبہ ہے جس سے ان کے کانوں کو بہرا نہیں ہونا چاہیئے۔

واذلم یکن من الموت بدٌ
فمن العار تکون جبانا

بلاشبہ میں آرزومند ہوں کہ مسلمان میدان میں اتریں، لیکن میں چاہتا ہوں کہ انھیں اس طرح میدان میں دیکھوں جس طرح ایک بہادر اور بے خوف آدمی میدان کا رخ کرتا ہے خود اعتمادی سے سر اٹھا ہو۔ عزم و یقین سے سینہ تنا ہو۔ وہ میدان کے خطروں سے بے خبر نہیں ہوتا۔ یہ خطرے ہر طرف سے آسکتے ہیں۔ مگر وہ

مسلمان اور کانگرس

میں ابھی ابھی کہہ چکا ہوں کہ مجھ سے زیادہ کوئی شخص اِس بات کا خواہش مند نہ ہوگا کہ مسلمان کانگرس میں شریک ہوں۔ لیکن مسلمانوں سے صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اگر وہ معاملہ کو اس صورت میں دیکھ کر قدم اٹھانا چاہتے ہیں تو بہتر ہے کہ نہ اُٹھائیں۔ اس طرح شریک ہونے سے ہزار درجہ بہتر ہے کہ شرکت کا نام بھی ان کی زبان پر نہ آئے اگر کانگرس میں شریک ہونا چاہیں تو صرف اس لیے کہ اُنھیں اپنے اوپر بھروسہ ہے۔ اس لیے نہیں کہ دوسروں نے انھیں بھروسہ دلایا ہے یا دوسرے انھیں بھروسہ دلا سکتے ہیں۔ اگر فی الحقیقت ان کی بے لبسی اور بے چارگی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ وہ سمجھتے ہیں خطروں اور تباہ حالیوں میں گھر گیے اور تحفظ کی راہ اس کے سوا کچھ نہ رہی کہ

ایک ایک رلیشہ مردہ ہوگیا دو حالتیں ہیں اور اس لیے حکم بھی دو ہونے چاہئیں۔ ایک بے عملی کا تعطل ہے ایک خود فراموشی کی موت ہے۔ اگر مسلمان کانگریس میں شریک ہو گئے تو یہ خود فراموشی کی موت ہوئی۔ تعطل آج نہیں کل دور ہو جائے گا۔ لیکن اگر موت آگئی تو اسے کون ٹال سکے گا؟ افسوس ان نادانوں کی سمجھ پر! یہ شاخوں اور پتوں کے لیے روتے ہیں۔ اور ان کے حصول کا طریقہ یہ سمجھتے ہیں کہ جڑ پر آرا چلاتے رہیں۔ حالانکہ نہیں جانتے شاخوں اور پتوں کا سارا کارخانہ جڑ کے دم سے قائم رہتا ہے جب جڑ ہی نہ رہی تو شاخیں کہاں سے آئیں گی؟ پھول پتے کس میں لگیں گے؟ یہ کہاں کی باغبانی ہے کہ پتوں کے عشق میں سر سے جڑ ہی کا خاتمہ کر دیا جاتا ہے آہ!

میر درد کا شعر کتنا پامال ہو چکا ہے پھر بھی اسے بھلایا نہیں جا سکتا۔

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ، تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

جانتا ہے کہ خطروں کے لیے اُسے دوسروں کی طرف نہیں دیکھنا ہے۔ خود اپنی ہمت اور پامردی پر اعتماد کرتا ہے، لیکن اگر وہ اس طرح میدان میں نہیں اُتر سکتے اور ساتھیوں سے شرطیں منوا لینے کی فکر میں ہیں تو بلا تامل اپنی ساری آرزوؤں سے دست بردار ہو جاؤں گا۔ میں یہ برداشت کر لوں گا کہ وہ میدان میں نہ اتریں مگر اسے برداشت نہیں کر سکتا کہ ڈرتے ہوئے سہمے ہوئے قدم اٹھائیں اس طرح کہ ڈرتی ہوئی روح اور کھوئی ہوئی ہمت لے کر اگر وہ میدان میں اترے بھی تو یہ زندگی اور عزت کا اقدام نہ ہوگا۔ بیچارگی اور نامرادی سے کسی کے پیچھے گھسٹنا ہوگا۔ انھوں نے جونہی معاملہ کو اس شکل میں دیکھا کہ وہ خطروں میں گھر گئے ہیں اور تحفظ کی شرطیں منوا کر ہی قدم اٹھا سکتے ہیں تو پھر ان کی ہستی باقی نہیں رہی انھوں نے زندگی اور کامرانی کی جگہ کھو دی۔ انھوں نے نامرادانہ ان لیا کہ وہ دوسروں کے رحم پر ہیں اور یہی مان لیا ان کے لیے سم قاتل ہے۔ وہ کانگریس میں شریک نہیں ہونا چاہتے نہ ہوں مگر خدا کے لیے یہ زہر کا پیالہ لبوں سے نہ لگائیں۔ یہ اُن کے حلق سے نیچے اترا اور اُن کے دل کا

وہ مردہ ہوگئی۔ اور مردے کے چاروں طرف قیمتی غذاؤں کے کتنے ہی خزانے جمع کردو۔ وہ زندہ نہیں ہوجائے گا۔

ڈاکٹر۔ امبیدکار نے اچھوتوں کی جنس کس فخر سے ہندوستان کے پاس رکھ دی۔ جو زیادہ بول بول سکے، آگے بڑھے اور خرید لے۔ کیا مسلمان چاہتے ہیں :۔

وہ بھی سیاست کی ایک ایسی ہی جنس بن کر رہ جائیں۔ جو ہمارے جی کا ڈونگال دے ہمیں خرید لے؟ اس بازار میں انھوں نے کبھی قوموں کی قسمتیں خریدی تھی۔ اگر آج اس قابل نہیں رہے کہ دوسروں کی متاع بہمت خرید سکیں۔ تو کم از کم خود اپنی ہمت تو اس ارزانی کے ساتھ فروخت کرتے نہ پھریں۔

:ر:ر:ر:ر:ر:ر:ر:ر:ر:ر

یہ کیا موت کے گھونٹ ہیں جو علانیہ مسلمانوں کو پلائے جا رہے ہیں اور کوئی نہیں جو اُن کا ہاتھ پکڑے۔ آخر بزدلی اور پست ہمتی کی بھی کوئی حد ہونی چاہیے آٹھ کروڑ انسانوں کو جن کی شکن آلود پیشانیوں پر آج بھی چودہ صدیوں کی تاریخ کے مدہم حروف پڑھے جا سکتے ہیں۔ یہ یقین دلانا کہ وہ مر گئے، تباہ ہو گئے اور اس قابل بھی نہ رہے کہ مستقبل میں اپنے مفاد کی حفاظت کر سکیں یقیناً ان کی خودداری اور خود اعتمادی کے سارے احساسات کو یک قلم قتل کر ڈالنا ہے اور اگر ایک جماعت ان احساسات کی روح سے محروم ہو گئی ہے تو پھر حقوق کے پروانے اور تحفظات کے چیتھڑے اسے کیا کام دیں گے۔ افراد کی طرح جماعتوں کی زندگی بھی روح سے ہوتی ہے۔ روح اگر موجود ہے تو سب کچھ ہے، روح اگر نکل گئی تو سب کچھ جاتا رہا۔ جسم جماعت کے لیے یہ روح کیا ہے؟ جماعتی شرف و عزت کا احساس، خود اعتمادی کا یقین، عزت و ہمت کا ولولہ، سعی و عمل پر اعتماد۔ جس جماعت میں یہ روح موجود ہے وہ زندہ ہے تو زندگی کے تمام لوازم حاصل کر کے ہی رہے گی جس جماعت نے یہ روح کھو دی

کا یہ حال تھا کہ اُف کرنے کی بھی اجازت نہ تھی اب چشم تر اور
نگاہ خونبار سے دیکھ رہے تھے کہ ایک جست میں برق رفتار اُن
کے قبضے سے نکل گئی اور وہ ہاتھ جو کل تک کسی کے پروبال مقید
سے بھرے ہوئے تھے اب خالی ہیں تا کہ جی بھر کے اپنی محرومی
اور بے بسی پر ماتم کریں۔

بہرحال انقلاب حال نے لیڈروں کے کیمپ میں ایک تہلکہ
مچا دیا۔ پچھلی جنگ کی ہزیمت سامنے تھی اور آئندہ کی خوفناک
ہزیمتوں کے سامنے اس لیڈری کے "سومنات" کا ہر بت لرزاں و
ترساں تھا۔ تاہم ایک رات درمیان میں باقی تھی اور جو کچھ ہونا
تھا ضرور تھا کہ طلوع آفتاب کی روشنی سے پہلے ہی انجام پا جائے۔
پس جب سومنات کے چھوٹے بتوں نے دیکھا کہ ہمارا عمل السحر
پر کچھ کام نہیں دیتا تو..... ! ان میں جو مست سے بہتر آدمی تھا
کہنے لگا کہ کیا میں تم سے نہیں کہا کرتا تھا کہ اپنے (اس آخری) معبود
ہی کی تسبیح و تقدیس کیوں نہیں کرتے رہو تمام مشکلوں کو حل کرنے والا
ہے۔

حدیث الغاشیہ

مرغ اسیر کی گرفتاری اور صیاد بے مہر کی تغافل شعاری کا مرثیہ ہمارے شعرا کی بدولت ایک عجیب دلچسپ داستان بن گئی ہے۔ فرض کیجئے کوئی خوش لحن طائر اپنے ہزاروں آرزوؤں اور تمناؤں سے پامال ہو اور اس کا منفذ ضعف آپ کی مضبوط مٹھی میں اس طرح دبا ہو کہ ذرا انگلیوں کو اور سخت کیجئے تو غریب کی کاغذی پسلیاں ریزہ ریزہ ہو جائیں۔ لیکن یکایک آپ کو ٹھوکر لگی اور اب جو دیکھتے ہیں تو ہاتھ خالی ہے اور وہ صید ستم کسی بلند درخت کی ٹہنی پر بے فکر و بے پروا بیٹھا ہوا چہچہا رہا ہے۔

بعینہ یہی حال فونڈیشن کمیٹی کے پہلے اجلاس کا تھا۔ وہ صیادان سخت پنجہ جنہوں نے قومی آزادی اور جماعتی رائے کی سنہری چڑیا کو برسوں اپنی آہنی انگلیوں میں دبا کر مقید کر رکھا تھا اور استبداد گر

الضدین" کا سامنا کرنا تھا۔ مریخ اور زہرہ دونوں کو جمع کرنا تھا اور مشتری کے گرد حلقہ کھینچنا تھا کہ "زحل" کے فرمان سے باہر قدم نہ نکالے۔ بہرحال عامل کا پنجہ سخت تھا۔ مریخ اور زہرہ دونوں کو ایک دائرے میں جمع کر کے ہی چھوڑا یہاں تک کہ زہرہ سے بہ ایں ہمہ ناز و عشوہ وعدہ لے لیا گیا کہ عین حضرت مریخ کے سامنے اپنا رقص ہوش افگن نظارگیانِ ارض کو دکھلائے گی۔

اس صحبتِ فلکی میں تو یہ عجائب و غرائب انجام پا رہے تھے اور ادھر زمین کے بسنے والوں کی قسمت سر پیٹ رہی تھی۔

نگذاز سعادت و نحوست مرا
ناہید بغمزہ کشت و مریخ بہ قہر

اصل یہ ہے کہ پہلے اجلاس میں جن بعض زبان آورانِ آزادی نے سرگرم تقریریں کی تھیں ان کی نسبت لیڈروں نے پہلے ہی سمجھ لیا تھا کہ ابھی ان سنہری ٹکڑوں کے لیے آگ کی آزمائش باقی ہے ۲۶ دسمبر کے جلسہ میں جب کہ لفظوں کی جگہ زبانوں سے شعلے نکل رہے تھے تو راجہ صاحب محمود آباد ہمارے مجلس طراز دست

پھر کیا تم نے "لات" اور "عزیٰ" نامی بتوں کو نہیں دیکھا ہے
اور وہ جو ایک سب سے بڑا تیسرا بت اور ہے اور جس کا نام
"منات" ہے۔

دعا مستجاب ہوئی اور بالآخر اعمال واشغال مخفیہ کی یہ عظیم
الشان رات اس طرح شروع ہوئی کہ سب سے پہلے اس اقدس
عمل تسخیر کو انجام دیا گیا جس کا ظاہری وسادہ نام لوگوں کی زبان
میں "ڈنر" ہے۔



راویان صداقت شعار اور ناقلان عدالت آثار روایت کرتے
ہیں کہ یہ عمل ساڑھے بارہ بجے تک بجمیع شرائط جاری رہا

اور جو کچھ کہ ہوا قابل اظہار نہیں

"تسخیر کواکب" کے عمل کی مشکلات آپ کو یا مجھ کو کیا معلوم،
ان سے پوچھیے جنہوں نے اس فن کے علم و عمل دونوں میں مشقتیں
حاصل کی ہیں۔ پھر مقصد جیسا کہ اہم ہوتا ہے اتنا ہی عمل بھی قوی ہوتا
ہے۔ اس عمل میں بڑی مشکل یہ تھی کہ قرآن السعدین نہیں بلکہ قرآن

ادائیں دیکھنے والوں میں تھے اور یہ جو اپنے حصّہ میں آیا تو اس پر شاکی نہیں ہمارے دوست کے ہم وطن یوسف علی خاں ناظم کا فلسفہ اس موقع کے لیے ہیں یاد تھا ۔

ادائیں سب کی تو سب لوگ دیکھتے ہیں مگر
ہم ان کی بگڑی ادائیں سحر کو دیکھتے ہیں

یہ تو اس شب وصل کی شام تھی اس کے ذکر کو کہیں جلد سمیٹیے کیونکہ اصل پرلطف حشر تو اس کے بعد آتا ہے جب کہ رندانِ بادہ گسار نے محفلِ نیم شبی آراستہ کیا اور موٹر کاریں بھیج بھیج کر ایک شریک پیمان کی قسمت حصّہ کو مردہ بادگساری سے بیدار کیا گیا۔

وقت آں نیست کہ بہ حجرہ بخوابی تنہا

چشمِ تصور سے کام لیجئے کہ دسمبر کی آخری ہفتہ کی سرد راتیں ہیں لیلائے شب کی زلف کمر سے گذر چکی ہے۔ ایک کنجِ خلوت میں صحبت بادہ پرستی گرم ہے اور گرم گرم سازشوں کی۔

دھری شراب ہے بیٹھے ہیں جابجا ساقی

قبل اس کے کہ آپ کسی مدعی زہد کو الزام دیں آپ ہی کو منصف

مسٹر محمد علی کو مخاطب کر کے دل ہی دل میں ضرور کہتے ہوں گے۔

مجلس طرازیوں کے چکھاوں گا سب مرے
تم اتفاق سے کہیں تنہا اگر ملے،

بالآخر انتظار میں زیادہ دیر نہیں لگی اور بہت جلد تنہائی کا گوشۂ خلوت ہاتھ آ گیا۔ خلوت کے اسرار و نیاز محرمانِ مجلس تک تو پہنچتے نہیں ہم ایسے غیروں کو کیا خبر تاہم یہاں تک تو تمام راوی متفق ہیں کہ راجہ صاحب نے اپنی شکست کا اعتراف کیا اور کہا کہ اگر ہرانا ہی چاہتے ہو تو ہار جانے کا اقرار کرتے ہیں اب اور اب کیا چاہتے ہو؟

ما سپر انداختیم اگر جنگ است

کہا جاتا ہے کہ راجہ صاحب نے کہا تھا کہ جب تک مسٹر محمد علی رام نہ کئے جائیں گے کچھ نہیں ہوگا یہی سبب ہے کہ اسی خلوت شب کی بارات کا دولھا نہیں کو بنایا گیا اور ذات بھر سہرے کی آرائش و تزئین میں صرف ہوئی۔ خیر ہم کو اس سے کوئی بحث نہیں ہم تو صبح کی چشم خمار آلود اور زلف پریشان کی

سہ
مست بر بستر من افتند و رندان دانند
حالتِ مست کہ بہ بستر ہشیار افتد

اب ادھر کی سنیے۔ یہاں تو شب زندہ دارانِ بادہ گساری، صبح خمار کی اعضاء شکنیوں میں کروٹیں بدل رہے تھے اور ادھر صبح آٹھ بجے ہی سے اجلاس، اجلاس کا ہال تماشائیانِ بزم سے بھر گیا۔ ایک دن پہلے حصول مقصد کے لیے جو تدابیر گوناں گوں و بوقلموں اختیار کی گئی تھیں من جملہ ان کے ایک تدبیر خاص یہ تھی کہ جلسے کے لیے ٹکٹ مقرر کر دیا گیا اور یہاں تک ہمیں بھی اتفاق تھا کیونکہ آج اسٹیج پر "پردے سے جو پتلیاں" نکلنے والی تھیں۔ وہ تھیٹر کے آموختہ یاد کیے ہوئے ایکٹروں کی طرح ایک تماشے سے زیادہ نہ تھیں۔ اس کے ساتھ ہی ٹکٹ کے لیے تھیٹر کے دروازے پر ٹکٹ گھر کی کھڑکی کا اعلان کیا گیا تھا۔ لیکن جو لوگ وہاں پہنچتے تھے ان سے کہا جاتا تھا کہ راجہ صاحب کے ہاں جائیے۔ راجہ صاحب کے ہاں سے صدا اٹھتی تھی کہ جہاں سے آئے ہیں اسی طرف پچھلے پاؤں پھر لیے

یاں سے واں، واں سے یاں حکم تو اوصل کی شب
ہم اٹھاتے ہی بچھاتے پھرے بستر اپنا

نہانے ہیں۔ کہ بھلا ایسی توبہ شکن اور ولولہ انگریز صحبت میں اگر ہمارے کسی دوست کی "توبہ" نے لغزش کھائی اور اس جام عہد فرسا کو منہ سے لگانے ہی بنی۔ جو کسی کے دست طلائی نے پیش کیا تھا انصاف کیجئے کہ آخر پہلو میں دل کس کے نہیں ہے اور پھر یہ تو وہ مقام ہے کہ "ھا اردت و ما اردت" کے قدم بھی لڑکھڑا گیے تھے سے

ساقیا مرنج از من عالم جوانیہاست

خود محبتِ آزمایانِ شبینہ کا بیان ہے کہ بادہ گساری رات کے دو بجے تک جاری رہی۔ اللہ اللہ جاڑے کی راتیں اور پچھلے پہر کی پراسرار صحبتیں، آپ الزام و اعتراض کی فکر میں ہیں اور "رات کے دو بجے" کے لفظ سے نہیں معلوم کیسے کیسے خیالات میرے دماغ میں گزر رہے ہیں۔ رات کی تاریکی، پچھلا پہر، رندانِ شاطر و کہنہ مشق کا ہجوم اور بعض نوجوان و نو آموز مدعیان حریت، پھر شغل مے پرستی کا یہ عالم اب کیا کہوں کہ کیا کہنا چاہتا ہوں۔

سے پہلے صحبت نیم بانشی کا اعلان کیا اور جنگل میں منادی کرنے والے "یوحنّا" کی طرح خبر دی کہ "راہ صاف کرو کیونکہ" آسمان کی بادشاہت" اب قریب ہے۔ یہاں تک دس بجے صدہا نے منتظرہ اور صدہائے مضطرب کی صفوں سے گذرتی ہوئی ارباب حل وعقد کی قطار جلوہ فروش ہوئی اور حجلۂ سازش کے تمام عروسانِ شب زندہ دار ایک ایک کر کے نظر نواز بزم و انجمن ہوئے۔ چہروں نے پہلی ہی نظر میں رمز فروشی کی کہ رات بھر میں رنگ بدل چکے ہیں ؎

شب تو شراب خوردۂ با تو صد نشانہاست

انہیں میں ہمارے شیوہ طراز دوست مسٹر محمد علی بھی تھے صحبت نیم شبی کا خمار آنکھوں میں اور شب بیداری کی فسردگی چہرے پر جی میں آیا بڑھ کے پوچھیں ؎

تو شبانہ می نمائی بہ بر کے بودی امشب
کہ ہنوز چشم مستت اثر خمار دارد

لیکن ہمارے دوست نے اپنی ایک رات کی حریف پرور اداؤں سے نئے دوستوں کا ایسا حصار ہجوم پیدا کر دیا تھا کہ اب

حالانکہ یہ سب انتظامات فضول تھے کیونکہ رات کے قول و قرار کے بعد سب مطمئن ہو گئے تھے کہ جب خیموں میں باہم صلح کر لی ہے تو میدان جنگ میں لڑائی کا اب کیا خوف! ناظم پاشا" جب ساتھ ہو گیا تو "کامل پاشا" بے فکر ہو گیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ فوج کی اصلی قوت اس کے ہاتھ میں ہے۔

غرضیکہ آٹھ بجے سے جلسہ منعقد اور صاحبانِ حل و عقد کا منتظر تھا لیکن کسی بزرگ کا پتہ نہیں اور پتہ لگے تو کیونکر جس جنگ کے لیے یہاں فوج جمع تھی، اس کی صلح رات کے دو بجے کی تاریکی میں انجام پا چکی تھی۔ بہر حال ادھر رونمائی میں دیر ادھر مشتاق دید کی بے صبری عجب کشمکش تھی۔

ہوتا ہے آخر دہام تمنّا اسی میں
ہر تی ہے جتنی دیر کشود نقاب میں

حضرت اکبر کے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں بطور "مقدمہ الجیش" کے تشریف لائے گو خود ان کا آنا "جلوہ یوسفی" نہ تھا۔ لیکن اپنے ساتھ "نسیم پیراہن" کی بشارت ضرور رکھتا تھا۔ انھوں نے سب

کے لیے تیار تھا، لیکن اب جو وہ تشریف لائے تو اسٹیج پر آتے ہی میں نے اُن سے پوچھا فرمائیے کیا ارادہ ہے۔ کہا صلح کاری کے ساتھ کام کرنا بہتر ہے مجھ کو یقین ہے کہ بحالت موجودہ میرا ریزولیوشن پاس نہیں ہو سکتا۔ میں نے اُسی وقت انا للہ پڑھ دیا کہ گو تمام "یورپین ٹرکی" ہاتھ سے جاتے مگر "صلح" رہے۔

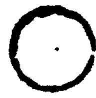
میجر صاحب کانفرنس کی صدارت کے لیے تشریف لائے تھے اور فی الحقیقت جس قابلیت اور صداقت کے ساتھ انہوں نے اپنے فرض کو ادا کیا وہ ان کی عظمت کے لیے بہت بڑی چیز ہے۔ پس بہتر تھا کہ فونڈیشن کمیٹی کے اجلاس میں حصہ نہ لیتے اور اس ریزولیوشن کو پیش ہی نہ کرتے۔ وہ نئے نئے قوم کے سامنے آئے اور آتے ہی اپنے تئیں ایک آزمائش میں ڈال دیا حالانکہ آزمائش کی راہ دوسری ہے۔

عاشقی شیوۂ رندانِ بلاکش باشد

ہم ایک شعر یاد کرنے لگے جس کا پہلا مصرع یاد نہیں آتا دوسرا مصرع یہ ہے۔

اس کا موقع ہی کب باقی رہا تھا ؎

جو کام ہیں غیر کے ہوئیں صرف
افسوس وہ دلربا ادائیں



دراصل فونڈیشن کمیٹی کی تمام بحث اسی پر آکر ختم ہوگئی تھی کہ ڈاکٹر میجر سید حسن بلگرامی کا ریزولیشن منظور ہو یا نامنظور، تمام دیگر مسائل طے پا چکے تھے اور اصل نقطہ جو ارباب کار کو حصولِ یونیورسٹی کی راہ میں نظر آتا تھا اب یہی ریزولیشن تھا یعنی گورنمنٹ کے اختیارات کا مسئلہ: ریزولیشن کے الفاظ یہ تھے:۔

"قوانین کالج کی دفعہ ۴۱ کے ضمن میں جو اختیارات اس وقت پیٹرن کو حاصل ہیں ان سے زیادہ اختیارات یونیورسٹی کی صورت میں حضور وائسرائے کو بحیثیت چانسلر نہ دیئے جائیں"۔

میجر صاحب نے اس تجویز کو بعد از ہزار سعی و مجاہدات پیش کیا اور تمام آزاد خیال طبقہ نے ساتھ دیا اور آخر تک ساتھ دیتے

معشوق بالبشیوۃ ہر کس موافق است
با ما شراب خورد و بہ زاہد نماز کرد



میجر صاحب کی تائید کے بعد میں نے تقریر کرنا چاہی لیکن خواجہ غلام الثقلین صاحب نے کہا کہ وہ ریزولیوشن کی نسبت ایک ترمیم قلمبند کر چکے ہیں اس کو پیش کریں گے چنانچہ خواجہ صاحب نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ تقریر کی اور دانشمندانہ طریقہ سے بعض اختیارات مہمہ کے محفوظ رکھنے کی ضرورت واضح کی لیکن انتظامات مخفیہ سرگرم کار تھے مخالفت کی آوازیں اٹھنا شروع ہو گئیں۔

اس عرصہ میں میں سوچ رہا تھا۔ تمام قیاسات کی تصدیق ہو چکی تھی اور معلوم ہو گیا تھا کہ آزاد خیال پارٹی کی قوت کو شکست دینے کے لیے ایک "عنصر" مرکب سے الگ کر لیا گیا ہے۔ ایک جال ہے جس میں سب کے پاؤں پھنس گئے ہیں پھر کیا رنگ بد ہوا دیکھ کر میں بھی خاموش ہو جاؤں۔ یہ ایک بڑی ہر دلعزیزی

اگر ماند شبے ماند شبے دیگر نمے ماند

بہر حال مجلس جم چکی تو پردہ اٹھا اور اس تماشہ کا ایک ہی ایکٹ شروع ہو گیا۔ سب سے پہلے عشوہ فرما دوست مسٹر محمد علی باہر نکلے اور ریزولیوشن پیش کیا۔ وہ بیٹھے تو سیجر سید حسن بلگرامی اُٹھے اور تائید کی۔

یکے بر ردی دلی رفت و پردہ دار یکے

اب نہ ۲۶ ر کے محرک تھے نہ موید:

یہ لوگ بھی غضب ہیں کہ دل پر یہ اختیار
شب موم کر لیا سحر آہن بنا لیا

غرضیکہ دو دن کی نہ لقیا نہ معرکہ آرائی کو اب اور کہاں تک طول دیا جاتا، اس کا فیصلہ یوں کیا گیا کہ بین بین طریقہ پسند کیجیے کہ خیر الامور اوسطہا۔ کفر و اسلام دونوں کو اختیار کیجیے اہرمن اور یزداں کو رام کیجیے صرف کعبہ کی طرف کیوں ہو رہیئے جب بتکدے سے بھی رسم و راہ رہ سکے۔ ایک ہاتھ میں زنار برہمن لیجیے اور دوسرے ہاتھ میں سبحہ زاہد۔

زبان کے حوالے کروں گا۔ دعا کرتا ہوں کہ خدا مجھے جلد کسی سخت آزمائش میں ڈالے۔

مجھ کو بعض صاحبوں نے روکا کہ اب مخالفت میں تقریر کرنا بے فائدہ ہے لیکن درحقیقت یہ ان بزرگوں کی غلطی تھی مخالفت اس لیے نہیں کی جاتی کہ موافقت کی صدائیں بلند ہوں بلکہ صرف اس لیے کی جاتی ہے کہ ایمان اور ضمیر کا حکم ہے۔ یہ حکم بالکل اس سے بے پرواہ ہے کہ لوگوں کا کیا خیال ہے۔ کوئی سچی بات اس لیے نہیں ترک کر دی جا سکتی کہ لوگ اس کا استقبال نہیں کریں گے سچ سچ ہے اگرچہ تمام عالم میں ایک بھی اس کا دوست نہ ہو

حریف کاوش مژگان خوں ریزش نئی ناصح
بدست آور رگ جانے ونشتر را تماشا کن

جلسہ میں اس وقت تین طرح کے لوگ تھے مجلس نیم شبی کے محرمانِ راز، ان کے متبعین جو خود اربابِ صحبت نہ تھے مگر اُن کے نام احکام جاری ہو گئے تھے اور کچھ عام لوگ جو اس ناگہانی انقلاب سے بالکل بے خبر تھے اور کوئی آواز اور رائے

اور احسان مندی تھی جو بغیر کسی نقصان کے حاصل ہوتی تھی۔ یہ خیال تھا جو اس وقت معاً ہر دماغ میں گزر سکتا تھا۔ لیکن گو قوت کا ایک لمحہ کے لیے بھی دعویٰ نہیں تاہم ایسے ایسے وساوس شیطانیہ کے لیے تو الحمد للہ اپنے پہلو میں ایک قوت رکھتا ہوں۔ ہر دلعزیزی کی خواہش ایک وسوسۂ شیطان ہے جس کی ایک نگاہ کرم کے ساتھ ہی ہمتوں اور استقامتوں کی بڑی بڑی چٹانیں پانی ہو کر بہہ جاتی ہیں لیکن جس دن میں نے اپنی پہلی آواز بلند کی اس دن سے اپنے پاؤں کو راہِ حق گوئی کی اس اولین زنجیر سے آزاد کر لیا تھا اور استقامت کی توفیق اللہ کے ہاتھ میں ہے میرے عقیدے میں ہر دلعزیز کا زیادہ صحیح نام "منافق" ہے۔ یہ محال قطعی ہے کہ ایک شخص "حق گو" ہو اور پھر بزم کفر و ایمان دونوں میں ہر دلعزیز ہو۔ یہ بالکل فضول کوشش ہے کہ دونوں میں سے کوئی نئی "درمیانی" راہ پیدا کی جائے۔

میں نے تو ارادہ کر لیا ہے کہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو لیکن اپنے ظاہر و باطن کو ایک رکھوں گا اور جو دل میں ہوگا اس کو

گو مئے ہے تند و تلخ پر ساقی ہے دلربا
اے شیخ بن پڑے گی نہ کچھ ہاں کیے بغیر

خواجہ صاحب کہتے ہیں کہ جب معاملہ یہاں تک پہنچا تو میں نے مناسب نہ سمجھا کہ اور زیادہ مخالفت کروں۔ عرصہ کے بعد کانفرنس میں آیا تھا۔ لوگ کہتے کہ اس نے چلتی گاڑی میں روڑا اٹکا دیا۔ بہر حال یارانِ طریقت نے خواجہ صاحب کو بھی چپ کرا ہی دیا ؎

پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے
اس کا نہ دیکھنا، نگہ التفات ہے

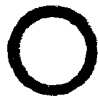
اب خواجہ صاحب کیا شکوہ کریں وہ کہتے ہیں کہ مجھے قسموں نے فرصت ہی نہ دی۔

ناز سے عشوہ سے غمزہ سے لگا لیتے ہیں
وہ جسے چاہتے ہیں اپنا بنا لیتے ہیں

خواجہ صاحب نے بھی دیکھا کہ کسی کی منتیں مفت ہاتھ آتی ہیں یہ ضد اور بحث کا موقع نہیں!

نہ رکھتے تھے ان میں بہت سے تعلیم یافتہ اور بہت سے سرگرم مدعیان آزادی و حریت تھے۔ مگر یہ سب اسی تیغ تیز سے زخمی ہوئے کہ مسٹر محمد علی کو تحریک کرتے دیکھا! وہی کمبخت مذاق تقلید جو کل تک پرانے لیڈروں کی اندھا دھند اتباع کی صورت میں خانماں سوز عقل و دانش تھا۔ آج آزادی کے عہد تازہ میں نئے لوگوں کے اتباع کی صورت میں فہم و درایت کی گردن کا طوق بنا۔ درد و ندامت کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اپنا عصری غلامی بھی مقلدانہ تھی اور اب آزادی مقلدانہ ہے۔

اب قدیم و جدید اور مستبدین و احرار کی "متحدہ سازش" سخت بدحواسی ہوئی کہ کہیں بنا بنایا کھیل نہ بگڑ جائے ہر طرف سرگوشیاں شروع ہوگئیں معاً خواجہ غلام الثقلین کو بھی ڈیپوٹیشن میں شریک کرلیا گیا۔ ان کا بیان ہے کہ مجھے اسٹیج کے "اقصائے مغرب" سے "مشرق اولیٰ" کی طرف کھینچ کرلے گیے۔ وہاں قسمیں کھا کھا کر اطمینان دلایا اور منتیں کیں کہ مان جاؤ۔ کیا کرتا مجبوراً ماننا ہی پڑا۔



غرضیکہ کہاں تک اسی افسانے کو طول دیجئے۔ زلف یار کی آج تک کوئی پیمائش کر سکا ہے۔

ماجرا ہاست بہ آں زلف جنوں سازمرا

بالآخر وہی ہوا جس کا ہزاروں تمناؤں اور آرزوں کے ساتھ انتظام کیا گیا تھا۔

یاں لعل جنوں ساز نے باتوں میں لگایا
دے پیچ ادھر زلف اڑا لے گئی دل کو

یارانِ کار فرما پر ایک ایک منٹ ایک ایک برس کا گزر رہا تھا جلدی تھی کہ نہیں معلوم کن کن اعمال مخفیہ اور "وظائف نصف اللیل" کے بعد اپنا بخت خفتہ بیدار ہوا ہے اور لوگوں کی آنکھوں پر غنودگی طاری ہوتی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ ادھر اُن کی آنکھ کھلے اور ادھر اپنی قسمت پھر چادر منہ پر ڈال لے۔ بہزار مشکل ان کو نہایت پتا تلا وقت دیا گیا تھا۔ لیکن ادھر ایک لفظ منہ سے نکلتا تھا اور اُدھر گھڑی دکھلائی جاتی تھی کہ وقت ہو گیا ؎

بڑا مزہ ہو جو محشر میں ہم کریں شکوہ
وہ منتوں سے کہیں چپ رہو خدا کیلئے

لے دے کے اک خواجہ صاحب ہمارے ساتھ اُٹھے تھے ان کو بھی ہمارے دوست سٹیج کے پیچھے لے گئے۔ بیچارے میر حسن کو بھی یہی شکایت تھی۔

جو کوئی آئے ہے نزدیک ہی بیٹھے ہے ترے
ہم کہاں تک ترے پہلو سے سرکتے جائیں

ہم تو اس وقت تقریر کر رہے تھے۔ کسے معلوم کہ اسٹیج کے گوشوں میں کیا ہو رہا ہے ورنہ خواجہ صاحب کو پہلے ہی خبردار کر دیتے:

لغزش نہ ہو ملا ہے حسینوں کا التفات
اے دل سنبھل وہ دشمن جاں مہرباں ہے اب

خیر بہتر ہے دنیا کو یہ عقل مندی اور مجھ کو اپنا جنون مبارک رہے

قسمت کیا ہر ایک کو قسّام ازل نے
جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا

میں کام آگئی۔ چیختے چیختے گلا بیٹھا جاتا تھا۔ مگر سینوں کے اندر آوازوں کا ایک سمندر بہہ رہا تھا۔ آواز اگلنے اگلتے منہ دکھے جاتے تھے مگر برق و رعد کا سیلاب تھا کہ کسی طرح بند ہی نہیں ہوتا تھا "بلغاری محاصرہ" کی پلٹنیں اپنی بیکاری سے کچھ اکتا سی گئی تھیں۔ اب انھوں نے ایک گھنٹہ کی خاموشی کی کسر یوں نکالی کہ کچھ دیر کے لیے بارہ دری کے اسٹیج کو "پامسٹن سرکس" کا تماشا گاہ فرض کر لیا اور لگے بے تال قلا بازیاں کھانے۔

دل از تمکین شود بے ذوق زنہار
گہے طفلے شود مستانہ می رقص

جن لوگوں نے ان عجیب و غریب گھڑیوں کو نہیں دیکھا ہے محال ہے کہ انھیں اس کی کیفیت سمجھائی جا سکے۔ چہرے جوش و ہیجان سے سرخ، گردن کی رگیں ابھری ہوئی، گلے شدت ہنگامہ سے پڑے ہوئے۔ ہاتھ میں اچھلتی ہوئی ٹوپیاں اور پاؤں میں اضطراب رقص۔ منہ سے کف اڑ رہا تھا اور چونکہ قریب قریب کھڑے تھے اس لیے آپس ہی میں ایک دوسرے کے چہرے پر پڑ رہی تھی

اس کی محفل کی دیکھنا تہذیب
بات کا انتظام ہوتا ہے

یکایک غل مچا کہ ریزولیوشن پاس کر دو۔ راجہ صاحب نے حضار مجلس سے پوچھا منظور ہے؟

این سخن راچہ بود البست توہم مے دانی
بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات تھی۔

اگر حلقہ نیم شبی کا بس چلتا تو اس سوال کا جواب زبان کی جگہ دل کے ٹکڑوں کی پیش کش سے دیتے۔

ساقی مے دے کہ اہل محفل
پانی پانی پکارتے ہیں

یکایک شور اٹھا کہ منظور! منظور!! منظور!!!



ریزولیوشن کے پاس کر دینے کی خوشی کے ہیجان نے ہوش و حواس کھو دیئے تھے۔ جن نوجوانوں نے پرسوں اپنی گلے بازی سرگرم تقریروں میں دکھلائی تھی آج ان کی گرج اس ہنگامے کے برپا کرنے

ہوا کہ دست بوسی کی یہ قیمت نقد متاع "خاموشی" کے انعام میں تھی۔ یہ مضطربانہ اظہار تعظیم و تکریم اس لیے تھا کہ وہ اگر اس وقت خاموش نہ رہتے تو یہ کشتیٔ طوفانی ساحل مراد تک نہ پہنچتی۔



حریفانِ خلوت نے "صحبت ہم شبی" کے مزے لوٹے لیکن اس بادہ گسارانہ فیاضی کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ صبح کی مجلس عام کو بھی سرشاری و بے خودی سے محروم نہ رکھا ؎

بے خود اس دور میں ہیں ہم سب حاتم
ان دنوں کیا شراب سستی ہے

لیکن ہم کہیں کہہ چکے ہیں کہ ہمارے ساقی ماآب دوست نے پلائی تو ضرور کوئی ایسی ہی شے جس کا رنگ سرخی مائل اور نظروں کے لیے ولولہ انگیز تھا لیکن اس میں شک ہے کہ کہیں پانی تو زیادہ نہیں ملا دیا تھا۔ کیونکہ ہم نے خود دیکھا کہ شام ہوتے ہوتے جمائیاں آنی شروع ہو گئی تھیں اور چہرے اکثر بے حال تھے۔ بارہ دری سے نکلنے کے بعد ہی چند مدعیانِ آزادی ملے جن سے

رومال نکال کر منہ پونچھنے اور پھر کف اڑاتے۔

منتظمین جلسہ کو کیا معلوم تھا کہ بارہ دری کی اسٹیج سے میدان رقص کا کام لیا جائے گا۔ ورنہ اس کی رعایت ملحوظ رکھتے نتیجہ یہ تھا کہ جوشِ تواجد میں گردشِ رقص کی جگہ نہیں ملتی تھی اس لیے جو رقاص جہاں کھڑا تھا وہیں اپنے پاؤں سے اسٹیج کے چوبیں تختوں کو کوٹ رہا تھا۔



لیکن اس عجیب نظارے کا ایک منظر تو رہ ہی گیا۔ جونہی ریزولیشن کے پاس ہونے کا غل مچا، ہم نے دیکھا کہ معاً راجہ صاحب محمود آباد اپنی کرسی سے مضطربانہ اٹھے اور نواب وقار الملک بہادر کے ہاتھوں کو بے اختیارانہ چوم لینا چاہا۔

نواب صاحب قبلہ کی جو سچی عظمت قوم کے دل میں ہے اس کے لحاظ سے اگر راجہ صاحب ان کے قدم بھی چوم لیتے تو یہ کوئی بڑی بات نہ تھی۔ لیکن ریزولیوشن کے پاس ہونے کے ساتھ ہی اس مضطربانہ اور بیخودانہ تعظیم کا مطلب ہم نہ سمجھے لیکن بعد کو معلوم

اور دلوں پر کچھ اس طرح قبضہ کر لیا کہ روٹھوں کو منا ہی نہیں لیا بلکہ دو ممبر اور بڑھا لیے۔

رنجیدہ می روی زسر کوئے او سلیم
چوں مے شود نیاید اگر از قفا کسے

٭٭٭٭٭٭٭

ہم نے پوچھا کہ یہ کیا ہنگامہ تھا تو وہ ریزولیوشن کا مطلب بھی نہ سمجھا سکے۔ جب کہا کہ بے سمجھے بوجھے آپ نے ہی تو رقص مقابلہ میں حصہ لیا تھا تو یکایک اُن کے سر میں خارش شروع ہو گئی حالانکہ اب ہاتھ کی جگہ سر نہیں پیشانی تھی۔

گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

وہاں تو سب دم بخود رہے لیکن ڈیپوٹیشن کی شرکت کا مسئلہ ایسا نہ تھا جو بعد کو یاد نہ آتا۔ ہم نے سنا ہے کہ بقیہ تمام دن اس معرکہ آرائی میں صرف ہوا۔

بہ بعد از انفصال اب اور ہی جھگڑا نکل آیا۔

بزرگانِ پنجاب نے فوراً اپنا بستر لپیٹا کہ ہماری نمائندگی تمام صوبوں کی نمائندگی کا کامل لحاظ رکھا گیا تھا۔ سنا ہے کہ جناب راجہ صاحب اسٹیشن پر دوڑے ہوئے گئے، کہ خدا کے لیے اور جوجی میں آئے کیجئے مگر روٹھ کر تو نہ جایئے۔

تم ہی سچے سہی اس بات کا جھگڑا کیا ہے

پرستش سے انکار کرتا ہے؟ انسان کے تمام قصور معاف ہو سکتے ہیں مگر ایک دوکاندار اس شخص کو تو کبھی معاف نہیں کر سکتا، جس نے اُس کے سامنے کی جگہ کو خالی دکان پر قبضہ کر کے رلہ کے خریداروں کو اپنی طرف کھینچ لیا ہو۔

ہمارے عقیدے میں یہ نتائج صرف اس بات کے ہیں کہ پنجاب میں تجارت کی ترقی نے بالعموم دکاندارانہ اخلاق پیدا کر دیا ہے۔ اور اغراض پرستی کی ہوائیں سب چل رہی ہیں تجارتی زندگی کا فوری نتیجہ یہ ہے کہ شب و روز باہم تصادم و تسابق ہوا۔ دھکوں میں ایسے موقعہ پر تجارت ہی کے میدان میں پیچ لڑائے جاتے ہیں، مگر یہاں یہ تدبیر اختیار کی گئی ہے کہ تلوار ایک جگہ قلم کا وار کر کے پھر باطمینان حریف کی دکان لوٹ لی جائے۔

یہ قصہ کئی ماہ تک جاری رہا اور اب تک جاری ہے۔ کیکر سنگھ نے غلام پہلوان سے عاجز آکر اس کی کن پٹی پر مکہ کی ایک سخت ضرب لگا دی تھی۔ اس طرح یہ قلم و کاغذ کے پہلوان جب عاجز آجاتے ہیں تو پھر ایک دوسرے کو گالیاں دنیا

زندہ دلوں کا وطن

یہ مانا کہ کسی ملک کی آب و ہوا جسم انسانی کے لیے خاص اثر رکھتی ہو۔ مگر یہ تو کچھ ضرور نہیں کہ ایک سرزمین کا اخلاق بگڑنے پر آئے تو پورے خطے کی حالت یکساں بگڑ جائے۔

ہم عرصے سے دیکھ رہے ہیں کہ پنجاب کے اخبارات گو خریداروں کے پیدا کر لینے اور نئے نئے کارخانوں کے چلا لینے میں ترقی کر رہے ہیں مگر ان کا اخلاقی تنزل نہایت درد انگیز ہے۔ کل کی بات ہے کہ زمیندار اور وطن میں جوتی بیزار ہو رہی تھی، اور جس طرح پنجاب میں پہلوانوں کے دنگل ہوا کرتے ہیں، اس طرح دونوں پہلوان ایک دوسرے سے گتھے ہوئے تھے۔ (زمیندار) کا صرف یہ قصور تھا کہ تھوڑے دنوں کے اندر ہی اس کی اشاعت پرانے اخباروں سے کیوں بڑھ گئی۔ اور کیوں وہ لاہور کے چند دولت مندوں کی

لنا املی بامس منثل یں کومسلط کر دیا۔

جب اس پر بھی باز نہیں آتے تو پھر فسق وفجور، حسد وحقد، ہوا پرستی ونفسانیت، نااتفاقی وبیگانگت میں ان کو مبتلا کر دیتا ہے۔ خود ہی کٹتے اور خود ہی مر جاتے ہیں۔

وما اھلکنا قریۃ الا اور ہم کسی آبادی کو تباہ نہیں کرتے واھلھا ظالمون مگر اس وقت جب کہ وہ ظلم ومعاصی میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

ہم اپنے معاصرین سے بہ منت التجا کرتے ہیں کہ خدا کے لیے اپنی ملت پر نہیں تو خود اپنے اوپر رحم کریں اور مسلمانوں کی موجودہ ذلت ورسوائی پر قناعت کریں۔ نفسانیت وخود پرستی کی حد ہو گئی ہے اور خدا کی طرف سے سب نے منہ موڑ لیا ہے تعجب ہے کہ ساری دنیا آپ پر ہنس رہی ہے اور آپ کو ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے اوپر رونا نہیں آتا؟ ملک ملت کی خدمت شاید اس طریقے سے الگ ہو کر بھی کی جا سکتی ہے، یہ تو کچھ ضروری نہیں کہ جب تک آپ ایک دوسرے کو چور ثابت

شروع کر دیتے میں فحش اور مغلظات سے بھی انہیں دریغ نہیں۔
ایک اپنے حریف سے پوچھتا ہے کہ وہ زمانہ بھی یاد ہے جب
کالج میں پڑھتے تھے؟ دوسرا کہتا ہے کہ زیادہ باتیں نہ بناؤ ورنہ
میں تمہارا فلاں راز فاش کر دوں گا۔ اب یہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے
کہ ایک دوسرے کو چور اور ڈاکو بتلاتے ہیں، ایک کہتا ہے کہ تم نے
طرابلس کے نام پر روپیہ کھا لیا ہے، دوسرا کہتا ہے کہ فرضی کمپنیاں
بنا کر قوم کو لوٹ لیا۔ یہ حالت صرف مسلمانوں ہی کی نہیں ہے بلکہ
اس حمام میں سب ننگے ہیں۔ ہندو اور آریا اخبارات کو دیکھو
تو وہ بھی ایک دوسرے کو ذلیل کرنے کے شریفانہ شغل ہی میں
خوش ہیں۔ بدبختو! صرف تم ہی ذلیل نہیں ہو۔ بلکہ تمہاری تمام قوم
اور پورا ملک ذلیل ہے۔ جب قوم پر خدا کا قہر نازل ہوتا ہے اس کا
یہی حال ہوتا ہے، پہلے اس سے حکومت چھین کر غیروں کو اس پر
مسلط کر دیتا ہے۔ بنی اسرائیل نے جب خدا سے منہ موڑا تو ان پر
ایک باہر کی قوم بھیج دی گئی۔

فبعثنا علیکم عبادا — پھر ہم نے تم پر ایک سخت شدید قوم

نہ کریں۔ اس وقت تک آپ کی زیر اصلاح قوم آپ کو اپنا امین نہ سمجھے گی۔ ؎

تو بخویشتن چہ کردی کہ بما کنی نظیری
بخدا کہ واجب آمد ز تو احتراز کردن

—— تمام شد ——